بے سوز کے شمع رہ منزل نہیں ہوتا
دل عشق میں جب تک نہ جلے دل نہیں ہوتا
ضامنؔ

چوتھا شوہر

قدیم باشندوں کی زندگی سے متعلّق

افسانوں کا مجموعہ

فاطمہ حسن

کتاب کا نام ۔۔۔۔۔۔ چوتھا پہر (کہانیاں زندگی سے متعلق افسانوں کا مجموعہ)

افسانہ نگار ــــــ فاطمہ حسن

ناشر ــــــ فاطمہ حسن

سن اشاعت ــــــ سنہ ۱۹۹۰ء

کتابت ــــــ ابوالکلام بہرایچی

تعداد ــــــ ۶۰۰ چھ سو

قیمت ــــــ آٹھ روپئے پچاس پیسے

ملنے کے پتے ــــــــــــــــ

۱۔ دانش محل۔ امین آباد، لکھنؤ

۲۔ نصرت پبلشرس۔ امین آباد لکھنؤ

۳۔ کتابستان۔ الہ آباد

فہرست

فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی

حکومت اتر پردیش کے مالی اشتراک سے
شائع ہوئی۔

انتساب

بصد خلوص و محبّت

"چوتھا شوہر" اپنے شوہر

ڈاکٹر امیر حسن

کے نام

تعارف

"چوتھا شوہر" پیش نظر ہے۔ مجموعے میں شامل افسانے یو پی کے قدیم باشندوں اور ان کی زندگی کے گہرے مشاہدے کے بعد لکھے گئے ہیں۔ یو پی کے قدیم باشندوں سے متعلق تحقیق کی ابتدا اس دن ہوئی تھی جب کول نامی آدی واسی بستی میں اپنے شوہر محترم جناب ڈاکٹر امیر حسن آئی۔ اے۔ ایس کے ہمراہ ضلع باندہ کے مانک پور کے جنگلوں میں گئی۔

بات سنہ ۱۹۶۳ء کے ابتدائی دنوں کی ہے۔ کسی سرکاری کام کے سلسلے میں ڈاکٹر امیر حسن مانک پور کے جنگلوں میں گئے جہاں انھیں دور سے کول آدی واسی بستی کو دکھایا گیا تھا اس کے بعد فرصت ملتے ہی اسی رات وہ مجھے لیکر کول قبائیلی بستی میں گئے۔

بکھری چاندنی کے ساتھ اس جنگل کے گھنیروں میں کٹھل اور آم کے بور کی خوشبو ہر سو پھیلی تھی الائچی کے درختوں کے پار تیندو کے جنگل اور اس کے بعد ہندوستان کے قدیم باشندے یعنی کول آدی واسیوں کی آبادی تھی۔ جگہ جگہ پھوس کے جھونپڑوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے پلنگوں پر سوئے پڑے قبائیلی ہمارے پہونچتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہی قبائیلی عورتوں اور بچوں کے غول اِدھر اُدھر سے

اگر ہمارے نزدیک اکٹھے ہونے لگے۔ وہ سب ہمیں محکمہ جنگلات سے متعلق اور پھر تیندو کی پتی جھڑوانے والے ٹھیکے دار اور آخر میں کھیتی کے کام کے لیے مزدوروں کی تلاش میں آنے والے سمجھے تھے اس کے علاوہ کوئی اور ان تک آنے والا تھا ہی نہیں۔ ہمارا تعارف معلوم ہو جانے پر بھی وہ اپنی محدود واقفیت کی وجہ سے کچھ اور سمجھ نہیں سکے۔ ہمارا مقصد صرف انھیں قریب سے دیکھنا اور ان سے گفتگو ہی ملاقات کرنا ہے یہ جان کر وہ سب حیران تھے۔ اپنی پلنگ پر ہمیں بٹھا کر وہ سب کھڑے کھڑے ہی ایک کے بعد دوسرا سوال ہم سے کرتے گئے۔ گھر آئے مہمانوں کی تواضع کے لیے خواتین لکڑی کے چھوٹے سے برتن میں دو چار جنگلی پھل اپنے جھونپڑوں سے لے آئیں۔

اس مختصر سی ملاقات کے بعد اپنے بھاری ذہن میں قبائیلی زندگی کی اصلیت غربت و افلاس اور صعوبتوں سے پُر ایک دشوار گزار زندگی کے خاکے لیے ہم واپس لوٹ آئے تھے مگر بار بار ان کے پاس جانے کی خواہش اور جا کر ان کی زندگی کا حقیقی رنگ دیکھنے کا شوق و تجسّس اپنے اندر لیے ہوئے۔

خدا جانے وہ کون سی کشش تھی ان آدی واسیوں میں اور ایسی کیا بات تھی کہ میرے شوہر ڈاکٹر امیر حسن کی دلچسپی ان کی زندگی کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے لیے بڑھتی ہی گئی ساتھ ہی ساتھ دائرہ بھی پھیلتا گیا۔ دھیرے دھیرے

یوپی میں آباد سب ہی قدیم باشندوں اور ان کی زندگی سے متعلق تحقیق و جستجو میں وہ سرگرم عمل ہوتے گئے اور آج یکہ ہیں۔ اس لمبے عرصے میں یوپی کے ہر آدی واسی قبیلے اور اس کی زندگی سے متعلق ان کا مطالعہ خاص عمیق اور وسیع ہوگیا ہے۔ ان کی شریک حیات وہم سفر و نصف بہتر ہونے کے رشتے سے یوپی کے قدیم باشندوں اور ان کی روزمرّہ زندگی کو بہت نزدیک سے جاننے سمجھنے اور دیکھنے کے مواقع از خود مجھے فراہم ہوتے رہے ہیں۔

جہاں تک میں نے دیکھا جانا اور سمجھا ہے قبائلی زندگی ایک الگ تہذیب و تمدّن رسم و رواج قاعدے قانون اور سماجی نظام لیے اپنی ہی دنیا کی معینہ حدود میں صدیوں سے ٹھہری سی نظر آئی جہاں قبائلی خواتین اور ان کی زندگی مخصوص اہمیت و برتری کے ساتھ میری اپنی اس مہذّب دنیا سے بالکل مختلف بلکہ برعکس رنگوں میں بڑی نمایاں جان پڑتی ہے گو کہ ان کی زندگی خاصی سخت محنت کش، مشکل و دشوار۔ قدامت پسندی اور کنارہ کشی کی حامل ہوتی ہے لیکن ان کی رنگینی طبع۔ سادگی اور پُرکاری میں مخصوص کشش بھی ہوتی ہے۔ شادی بیاہ۔ شوہر سے علیحدگی دوسری شادی یا شادی سے قبل ہونے والی بدعنوانیوں کے لیے سماجی اور قانونی نظام کا عین انسانی فطرت کے مطابق و موافق ہونا۔ انھیں سماجی برتری کے ساتھ قبول کرلینا۔ سماجی و قانونی تحفظ کا ہر حال میں حاصل رہنا۔

قبائیلی نظام زندگی کا یہ انوکھا پن خود بخود ترقی یافتہ ہمارے سماج اور نظام زندگی کے مدمقابل خصوصیت سے جدیدیت کا عنصر لیے نظر آتا ہے اس کے لیے اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ آج جس آزادی کو پالینے کے لیے ہماری مہذب دنیا کی خواتین کوشاں ہیں وہ آزادی آدی واسی خواتین کو صدیوں پہلے سے ہی حاصل رہی ہیں۔

اس کے علاوہ قبائیلی زندگی کی ایک بڑی اہم خصوصیت اور بھی ہے کہ رسم جہیز کے لین دین کی لعنت سے قطعاً پاک ہیں۔ ان کی شادیوں میں کسی تجارتی ہوس کا گزر بھی نہیں ہوتا ہے شادی کا مقصد صرف اور محض شادی ہی ہوتا ہے۔

قبائیلی طرز زندگی ان کی روزمرہ زندگی کے عکس۔ ان کی زندگی کے تمام تاریک و روشن پہلوؤں، عقائد و خیالات۔ درپیش مسائل و واقعات کو اچھی طرح جان اور پرکھ لینے کے بعد ہی حوصلہ ہوا کہ قبائیلی زندگی ان کے حقیقی رنگوں میں افسانے کی شکل میں پیش کردوں۔

مجموعہ "چوتھا شوہر" میں شامل افسانے یوپی کے مختلف قبائیلیوں کی زندگی پر لکھے گئے ہیں جن کے ذریعہ اصل قبائیلی زندگی سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے ہر افسانہ اپنی جگہ یوپی کے کسی ایک قبیلے سے متعلق معلوماتی خلاصہ اور مکمل واقفیت سے پر ہے اس میں اُجاگر ہونے والے قبائیلی خاکے ان کی زندگی کے حقیقی رنگ میں ہیں اس پورے مشاہدے اور مطالعے کے دوران قبائیلی زندگی

سے متعلق جب جب اور جہاں جہاں کوئی احساس و تاثر پیدا ہوا وہ کسی نہ کسی افسانے کی وجہ تحریک بن گیا۔ چوں کہ یہ افسانے ایک الگ قسم بلکہ برعکس پس منظر کے حامل ہیں اس لئے یہ مختصر سا تعارف اپنے قاری کے لیے پیش کرنا ضروری تھا اسی مجموعے سے متعلق دیگر باتوں کے لیے مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔ قاری کا اپنا نظریہ اور ان کی اپنی رائے ہی اسے پایۂ تکمیل بخش دیں گی۔

محترم جناب شفاعت علی صاحب کی بیحد ممنون و مشکور ہوں جن کی گراں قدر توجہ سے مجموعے کی اشاعت کے سارے مراحل طے ہوئے۔

فاطمہ حسن

معرفت
ڈاکٹر امیر حسن آئی۔ اے۔ ایس
ممبر پبلک سروس کمیشن الہ آباد
۲۰؍ جولائی ۱۹۸۹ء

بھائی کا رشتہ

شنّو نے ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ ساری باتیں تولارام کو بتائیں تو اس کا
ایک ایک لفظ گویا کانٹے بن کر بستر پر بکھر گیا تولارام کو کسی کروٹ چین نہیں
مل رہا تھا۔ یہ بخار کی حدت نہیں تھی نہ جانے کیسی گرمی تھی جو شعلہ بن کر بار بار
اس کے وجود کو جھلسائے دے رہی تھی۔ ہر بار تولارام کروٹ بدلتا پاس رکھے
لوٹے سے پانی پیتا مگر ایک گھونٹ سے زیادہ پی بھی نہیں پاتا۔ لوٹا واپس رکھ
کر وہ پھر لیٹ جاتا مگر کانٹوں کی چبھن تھی جو آرام لینے نہ دیتی اس کا سارا
بدن پسینے سے بھیگا تھا۔ ماں گھبرا کر کبھی اس کے ماتھے پر پٹی رکھتی اور کبھی
پنڈلیوں کو ٹٹولتی۔ بخار تو اب ہے نہیں پھر کیا ہو گیا ہے۔ کونے میں بچھے
کھٹولے پر بیٹے کو لیے شنّو لیٹی تھی۔ تولارام کی بے چینی سے ماں زیادہ بےچین
تھی بہو کو عجب بے حسی سے لیٹے دیکھ کر ماں تڑپ اٹھی۔

"تم اٹھ کر دیکھو تو شنّو تولارام کو ہو کیا رہا ہے۔ بخار تو اب بالکل نہیں
ہے۔ مگر پسینہ بہت آ رہا ہے۔ اتنی ٹھنڈک ہے پھر بھی۔؟"

لیکن شنّو پر ماں کے کہنے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ بچے کو تھپکتے

ہوئے بغیر پلک جھپکے تولارام کو تکتی رہی۔ ماں اب برداشت نہ کرسکی بہو پر بگڑ اٹھی۔ لیکن تولارام نے اسے خاموش کردیا تھا۔

"تم تو پر خفا مت ہو ماں — تم جاکر سوجاؤ اور کل سے کہیں اور کام کرو ماں — پھول سنگھ کے کھیتوں پر مت جانا"

تولارام کے کہنے پر ماں پریشان ہوگئی تھی۔ اس کے سامنے بہت سے سوال اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ قرض کیسے ادا ہوگا؟ مقروض کولٹا کسی دوسری جگہ مزدوری کیسے کرسکے گا؟ جو کچھ ہوا ہے یہ تو ہر کولٹا ہریجن کی زندگی کے ساتھ چلا آیا ہے۔ پھر کیوں تولارام کام پر جانے سے روک رہا ہے — آخر وہ پھول سنگھ خاصہ کا مقروض ہے — تولارام کی بات ماں سمجھ نہیں پارہی تھی مگر تولارام ماں کی بات سمجھ کر بھی اسے پھول سنگھ کے کھیتوں پر کام کرنے سے روک رہا تھا۔

دلکش قدرتی مناظر سے بھری پہاڑیوں میں آباد خاصہ اور کولٹا قبیلے اپنی خوبصورتی کے ساتھ ایک الگ تہذیب و تمدن کے لیے بھی مشہور ہیں یہ خود کو پانڈوں کے خاندان کا بتاتے ہیں۔ سماجی اعتبار سے یہ قبائلی مہذب دنیا سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ آج بھی ان کی اپنی الگ دنیا ہے جہاں ان کے اپنے رسم ورواج، قاعدے قانون، نظام زندگی اور سماجی نظریے،

ہیں۔ چوں کہ ان کا سلسلۂ نسب پانڈوؤں سے ملتا ہے اس لیے ان کے یہاں ایک عورت کے بیک وقت کئی شوہر ہوتے ہیں۔ پانڈو دروپدی کو لائے ماں کو پکارا "دیکھو ماں ہم کیا لائے ہیں"۔ اور بغیر دیکھے ماں کا جواب تھا "جو کچھ لائے ہو پانچوں بانٹ لو" ماں نے دروپدی کو کوئی چیز سمجھا تھا۔ اور ماں کے حکم کے مطابق دروپدی پانچوں میں بٹ گئی ۔۔۔!

پانڈوؤں اور دروپدی کا زمانہ گزر گیا مگر خاص ادر کوبلٹا قبیلے میں چند شوہری کی رسم دروپدی کی ساڑی کی طرح پھیلتی گئی۔ پہاڑیوں کے آنچل میں بسے ان قبیلوں نے اس رواج کو آج بھی اپنا رکھا ہے یہاں شادی صرف بڑے بھائی کی ہوتی ہے مگر بیوی وہ سب بھائیوں کی ہوتی ہے۔

پہاڑوں کا سینہ چیرتی ہوئی جمنا ندی کے ایک طرف ٹہری گڑھوال اور اتر کاشی ہے۔ دوسری طرف جولنسار بادر کا خوبصورت علاقہ۔ حدِ نگاہ تک برف پوش پہاڑیوں کے درمیان سے نکلی ہوئی سڑک کالسی دہرہ دون اور لکھوا پل کو پار کرتے ہوئے اس قبایئلی علاقہ کو جاتی ہے جسے قدرت نے لازوال حسن بخشا ہے۔ پورا علاقہ اونچی نیچی اور کھڑی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ گاؤں عام طور سے سیڑھی دار کھیتوں کے درمیان بسے ہوئے ہیں زراعت ہی یہاں کے باشندوں کا تنہا ذریعۂ معاش ہے۔ لیکن زندگی یہاں بھی دو حصوں میں بٹ

گئی ہے۔ ایک طبقہ اس زمین کا مالک ہے تو دوسرا اس زمین کا محنت کش مزدور۔ اس قبائیلی علاقے کی یہ جفاکش زندگی یعنی کولٹا ہر یجن یہاں آج بھی اونچے طبقے کے راجپوت خاصاؤں کے رحم وکرم پر اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ زمینوں کا مالک خاصہ اپنی عورتوں کا حسن بھی اپنی ملکیت کی طرح سنبھال کر رکھتا ہے جبکہ محنت کش مزدور کولٹا غربت سے مجبور ہوتا ہے۔ قرض کے بوجھ سے دبے کولٹا کو شہروں سے آئے تاجر چمکتی دمکتی دنیا کے سبز باغ دکھاتے ہیں، تنگ دستی اور بڑھاوا دیتی ہے۔ بیوی بیٹی اور بہن کو بیچنا ضرورت اور غربت سے مجبور کولٹا کے لیے باعث شرم نہیں ہے۔

سڑک کے کنارے اونچی پہاڑی پار کرکے کولٹا بستی تھی جس میں تولارام کا بھی گھر تھا۔ پتھر اور لکڑی کے بنے گھر میں آنکھیں کھولنے پر اس نے والدین کے ساتھ اپنی دو بہنوں کو بھی دیکھا تھا۔ ماں اور باپ دونوں ہی پہاڑی کے پار گلاب سنگھ خاصا کے سیڑھی دار کھیتوں میں کام کرنے جاتے تھے اور تولارام کولٹا گلاب سنگھ خاصا کے بیٹے پھول سنگھ خاصا کے ساتھ لیچی کے باغوں کا رُخ کرتا یا پھر جمنا میں تیرتے ہوئے جونسار سے جونیار تک جاتا تھا۔ یوں قبائیلی زندگی گزر رہی تھی کہ ایسے میں ایک دن اس کی بڑی بہن رادھا کو دلی سے آیا پینتالیس سالہ رام لال پندرہ سو روپے میں اپنے دیش لے گیا۔ کولٹا حسن میدان

کو گیا اور روپے ساہوکار خاصہ کی تجوری میں۔ لیکن قرض کی پوری ادائیگی نہ ہو سکی تھی۔ اس لئے کچھ عرصہ بعد چھوٹی بہن شیاما کو انیس سو روپے کے عوض جو نپار کا دھنی رام لے گیا۔ گھر بہنوں کے چلے جانے سے سونا ہو گیا تھا لیکن پھر بھی ساہوکار کا قرض اس کا باپ ادا نہ کر سکا تھا۔

اچانک کوٹلا بستی میں وبا پھیلی۔ تولارام کا باپ بھی اس وبائی مرض کا شکار ہو کر چل بسا تو ماں اور بیٹے گلاب سنگھ کی زمینوں پر کام کرنے لگے پھول سنگھ ٹھاکر اور تولارام کو لٹا کے درمیان دوستی اب بھی تھی لیکن حاکم اور محکوم کا انداز لیے ہوئے۔

ان سب باتوں کے باوجود یہاں زندگی خوبصورتی خوشی اور رنگینی سے بھرپور ہے رقص و موسیقی انھیں مشقت اور مایوسی کی کلفتوں سے بہت دور لے جاتی ہے نگاڑوں اور تر ہی کے ساتھ ہونے والے رقص میں یہ قبائلی اپنا روایتی لباس بھی پہنتے ہیں گھر کے سامنے والے آنگن میں رقص کے لئے اکٹھے ہونے والے نوعمر لڑکے اور لڑکیوں میں تولارام اور شنّو بھی تھے اس رات شنّو کا پہلا عکس جو آنکھوں سے سیدھا دل میں اتر گیا تھا۔ تولارام کی نگاہوں میں آج بھی تنہا۔ کالی چوٹی کے اوپر بندھا ہوا سُرخ رومال جس نے آدھا سر ڈھک رکھا تھا۔ کانوں میں ہلتے لمبے لمبے بُندے۔ نیلے لہنگے پر کالی مخمل کا لیس لگا ہوا کرتا پہنے سنگِ مرمر کا جیتا جاگتا مجسمہ شنّو ہنس ہنس کر سہیلیوں سے باتیں کر رہی تھی۔ شنّو کی نگاہیں بھی تولارام پر گڑی تھیں

آدھی رات تک ہونے والے اس رقص میں شنو اور تولارام ساتھ تھے اور زندگی بھر ساتھ رہنے کا وعدہ کر چکے تھے شنو کے اس فیصلے سے بہت سے قبائیلی نوجوانوں کے دلوں پر اداسی پڑ گئی تھی۔ اس کے بعد تو پھول سنگھ خاصا نے بھی کوٹ بستی کے چکر کم کر دیئے تھے۔

رسم کے مطابق زیور کپڑوں کے علاوہ تولارام کو ایک معینہ رقم بھی شنو کے باپ کو دینی تھی۔ پھول سنگھ خاصا نے حق دوستی ادا کیا مطلوبہ رقم مہیا کر دی۔

شادی ہوئے دو سال گذر چکے تھے۔ مشکور تولارام پھول سنگھ سے آدھی مزدوری لیتا اور آدھی قرض کی ادائیگی میں کٹا دیتا۔ پورے گاؤں میں عجیب قسم کا بخار پھیلا ہوا تھا۔ تولارام بھی بیمار پڑ گیا تھا۔ تین ہفتوں سے وہ بستر پر پڑا تھا۔ ان دنوں کھیتوں پر کام کرنے صرف اس کی ماں جا رہی تھی۔

اس درمیان پھول سنگھ کئی بار تولارام کی عیادت کو آیا چیتھڑوں میں لپٹی خوش اور مطمئن شنو جھونپڑے میں چہکتی ہوتی۔ شنو آج بھی بہت خوبصورت تھی۔ پھول سنگھ کے دل میں برسوں سے دبی خواہش نے سر اٹھایا آخر ایک دن مزدور نہ ملنے اور بوائی کے پچھڑ جانے کا تذکرہ کرتے کرتے کہہ اٹھا۔

"جب تک شنو کو ہی کام پر بھیج دو"۔

"ارے ابھی بچہ بہت چھوٹا ہے" دھیمے لہجے میں تولارام نے معذرت کی۔

دو چار دنوں کے وقفے کے بعد پھول سنگھ نے پھر اپنی بات دہرائی۔

"بچے کو تم رکھ لینا تولا۔ دیکھو میرا بڑا نقصان ہو رہا ہے بوائی کا وقت گزرا جا رہا ہے۔"

پھول سنگھ کہتا رہتا اور تولارام خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہتا مگر کب تک وہ پھول سنگھ کی باتوں کو ٹال سکتا تھا آخر میں احسان مند مقروض اور پھر دوستی کی وجہ سے تولارام نے شنّو کو پھول سنگھ کے ہمراہ کھیتوں پر کام کرنے کو بھیج ہی دیا۔

روتے بچے کو گود میں اٹھا کر شنّو نے لٹے ہوئے ویران لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"نہیں حویلی میں لوا گیا تھا۔ اس کے گھر والے سب باہر کہیں گئے ہوئے تھے۔" شنّو کہتے کہتے رک گئی۔ تبھی کھیتوں سے ماں لوٹ آئی تھی۔

پسینے میں نہایا تولارام بستر پر بیٹھا تھا اور شنّو کو تکے جا رہا تھا پانی کا گھونٹ حلق سے اترتا ہی نہیں تھا۔ تولارام بستر پر لیٹ گیا تھا۔ اسے کسی کروٹ آرام نہیں مل رہا تھا۔ ساری رات نہ وہ سو سکا اور نہ ہی شنّو کو نیند آئی۔ پھول سنگھ نے دونوں کا ہی سکون چھینا تھا۔ تولارام سمجھ گیا تھا کہ اس کے بیمار پڑ جانے سے پھول سنگھ کا کوئی کام رکا نہیں تھا اور نہ ہی بوائی کا نقصان

ہو رہا تھا بلکہ اس کا مقصد کچھ اور تھا۔

دوسری صبح بھی تولارام بضد تھا" ماں ۔ پھول سنگھ کے کھیتوں پر مت کام کرو۔ کہیں اور کام کر لو"۔

ماں بیٹے اور شنو تینوں ہی اب نرائن سنگھ خاصا کے پھلوں کے باغیچے میں کام کرنے لگے تھے۔ کئی مہینے گزر گئے۔ پھول سنگھ بار بار اپنی رقم کی ادائیگی کے لئے تولارام سے کہتا۔ اسے کھیتوں پر کام کرنے کے لئے بلا بھیجتا لیکن تولارام ٹال دیتا یا پھر چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہتا۔

محض تقاضوں سے کام نکلتا نہ دیکھ کر پھول سنگھ خاصا نے گاؤں کے راجپوت خاصاؤں سے اپنی بات کہی۔ خاصا اکٹھے ہوئے اور نرائن سنگھ خاصا کے پاس پہونچے۔ پورا حال سن کر نارائن سنگھ نے تولارام کو لٹا کو بلا کر کہا۔

" تولارام۔ پھول سنگھ کا قرض ادا کر دو۔ نہیں تو جاؤ ان کے کھیتوں پر کام کرو"۔

تولارام خاموش کھڑا تھا سبھی خاصا بولنے لگے تھے انھیں کو لٹا مزدور کی اس بے اصولی پر بڑا غصہ آرہا تھا۔ آخر تولارام نے سیدھے پھول سنگھ خاصا کو مخاطب کر کے اپنی دلیل پیش کی۔

" ہم تم تو اب بھائی بھائی ہیں پھول سنگھ ۔ بھائیوں کے بیچ قرض

کیسا؟" "بھائی ــ؟" پھول سنگھ خاصا غصہ اور نفرت سے چیخ اٹھا۔

"تم ــ تم تولارام کولٹا ہریجن اور ہم راجپوت خاصا ــ بھائی بھائی

کیسے ہوئے؟"

"ہاں" ــ تولارام ٹھہرے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا "مگر اپنے قبیلے

کا چلن مت بھولو پھول سنگھ ــ ہم تم تو اسی دن بھائی بھائی ہو گئے تھے

جس دن تم شنّو کو حویلی لوالے گئے تھے اور خود ہی اپنا حق وصول کرکے ہمارے

چھوٹے بھائی بنے تھے ــ قبیلے میں پیڑھیوں سے چلی آرہی اس "ریت"

کا لحاظ بھی اب تمھیں خود ہی رکھنا پڑے گا۔

تولارام کولٹا ہریجن کے اس بے دھڑک جواب پر سامنے موجود سارے

راجپوت خاصا حیران دشتشدر کھڑے رہ گئے تھے اور پھول سنگھ خاصا نے اپنے

خشک پڑ گئے ہونٹوں پر زبان پھیرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

"پھر وہی زندگی ہماری"

نمبردار حاجی رمضان علی نے فیصلہ سنایا تو کونے میں بیٹھی جیناں بانو آنسوؤں سے رو پڑی۔ میراں بانو بیٹی کے آنسوؤں اور گھٹتی سسکیوں کو برداشت نہیں کرسکی وہ تلملا کر اٹھ کھڑی ہوئی اس کا خطاب سیدھے پنچایت کے سربراہ نمبردار حاجی رمضان علی سے تھا۔

"نمبردار جس خدا اور رسول کا خوف دلا کر اور دین ایمان کا واسطہ دیکر تم نے میری بیٹی جیناں بانو کے طلاق کی درخواست رد کردی ہے میں پوچھتی ہوں کیا ان کا خوف خود تمھیں نہیں ہے؟ انھیں کا دیا حق لینا چاہتی تھی جسے تم برا بتاتے ہو۔"

اس سیدھے صاف سوال کے لئے نمبردار تیار نہیں تھے وہ مہندی سے سرخ اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کے رہ گئے۔ وہاں موجود سارے گجروں کی نگاہیں نمبردار کے چہرے پر مرکوز تھیں جو سامنے پلنگ پر بیٹھے پان چبا رہے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر انھوں نے پیتل کے حقّہ کو نزدیک کیا اور گھبرا کر جلدی جلدی کش لینے لگے۔

وہاں موجود گجروں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا آپس میں سرگوشی کی گرد میں ہلائیں گویا معاملہ خاصا سنجیدہ ہے۔ گجروں کی روایت میں یہ پہلا موقعہ تھا جب پنچایت میں کسی گجر خاتون کی خلع لینے کی درخواست پیش ہوئی تھی کہ جیناں بانو کا شوہر احمد حسین اسے طلاق دے دے۔ اس سے بھی تعجب خیز یہ پہلا موقعہ ظہور پذیر ہوا جب بھری برادری اور پنچایت کے سامنے نمبردار کے فیصلے کے بعد بھی میراں بانو نے آواز اٹھائی تھی۔

گجر قبیلوں کے معمر اور سربر آوردہ گجر گڑھوال۔ کمایوں۔ دہرہ دون کے پہاڑی جنگلوں سے نکل کر آج بجنور کے جنگل میں آباد اس گجر قبائیلیوں کی بستی میں اکٹھے ہوئے تھے۔

یہ گجر قبائیل اپنے آپ کو شاہ اکبر خان کی اولاد بتاتے ہیں جس نے شہر گجرات بسایا تھا۔ نویں صدی عیسوی میں اس کی حکومت گجرات، پنجاب اور جموں کے علاقوں پر قائم تھی۔ لیکن جب یہ علاقے شاہ کشمیر کی حکومت میں شامل ہو گئے تو چند گجر قبیلے دہرہ دون کے جنگلوں میں آبسے اور اس وقت سے آج تک یہ گجر قبائیل جنگلوں میں زندگی کی ایک صورت میں آباد تو ضرور ہیں مگر خانہ بدوشوں کی طرح بغیر کسی مستقل رہائش گاہ۔ زمین اور چراگاہ کے۔ اپنی قسمت پر قانع عام دنیا سے روپوشی اور علیحدگی کی زندگی گزارتے ہیں۔

مگر خود اپنے گجر قبیلے کے نظام و قانون اور اپنے اسی خاص تہذیب و تمدن کے اندر رہ کر زندگی کے دن گزارتے ہیں۔ ان کے قانون کے مطابق گجروں میں بیک وقت کئی کئی بیویاں رکھنا قانوناً جائز ہے مگر ان کے قانون کی رو سے عورت کو خلع یا طلاق ملنا ناممکن ہوتا ہے۔ بھینس پال کر دودھ بیچتے ہیں مگر دودھ میں پانی ملانا گناہِ عظیم سمجھنا ان کا ایمان ہے۔ رشی کیش ہری دوار سے سائیکلوں پر آ کر منوں دودھ لیجانے والے خود گجروں کی ایمانداری کے قائل ہیں۔

بیس سال قبل فجو گجر کا بیٹا کلو جب میراں بانو کو بیاہ کر لایا تھا تو گویا نورِ ایمان کی ایک روشن کرن اس گجر بستی میں آ گئی تھی۔ پچاس بھینسیں وہ جہیز میں اپنے میکے سے لائی تھی اور باقی سسرال میں پہلے ہی سے تھیں اس طرح سو سوا سو بھینسوں کا کام نپٹا کر بھی میراں بانو پاس پڑوس کی عورتوں اور بچیوں کو نماز پڑھانے اور قرآن پاک کے سبق دینے کا وقت نکال لیتی تھی اس کی قابلیت اور شعور نے جلد ہی اس کے سسر فجو گجر کو بستی والوں کی زبانی فیاض الدین اور شوہر کلو کو کلیم الدین کہے جانے کا رتبہ دلوایا تھا۔ اور تو اور مکتب کے مولوی صاحب بھی اس کے سامنے اردو کا قاعدہ اور سپارہ بچوں کو رٹاتے ہوئے گڑبڑا اٹھتے تھے۔

اور پھر جب رمضان علی کی اٹھارویں اور ان کی پانچویں بیوی کی پہلی

اولاد سکینہ کو سمجھ دیکر ان کی وہ پانچویں بیوی فوت ہو گئیں تو اس ننھی سی جان سکینہ کو منحوس قرار دیکر اس کی پرورش کی ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے رمضان علی کی چار چار تندرست بیویوں میں سے کوئی بھی تیار نہیں ہو رہی تھیں تو یہ میراں بانو کا ہی دم تھا کہ ساری بستی کی مخالفت کے باوجود اپنے دو چھوٹے بیٹوں اور ایک پھول سی بچی جنیاں بانو کے ہوتے ہوئے سکینہ کو سینے سے چمٹائے اپنے گھر لے آئی تھی۔ اور اپنی بیٹی جنیاں اور سکینہ میں کبھی کوئی امتیاز نہیں برتا۔

دو سال بعد رمضان علی رات میں سکینہ کو اپنے پاس لے آنے لگے تھے مگر فجر پڑھنے کے بعد وہ سب سے پہلے سکینہ کو میراں بانو کے پاس پہونچاتے تب اپنے کام کو ہاتھ لگاتے اور جب سورج سیدھا آسمان پر آجاتا تو وہ سکینہ کو لیتے ہوئے اپنے گھر کے اندر روٹی کھانے آتے تھے۔ برسوں گزر گئے مگر رمضان علی کے معمول اور میراں بانو کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ سکینہ کا وہ جنیاں سے زیادہ خیال رکھتی تھی

آٹھ نو سال کی عمر میں جنیاں بانو کے ساتھ ساتھ سکینہ بھی قرآن ختم کر چکی تھی اور اب میراں بانو کی طرح دونوں لڑکیاں بھی پنج وقتہ نمازیں پڑھنے لگی تھیں۔ بھینسوں کے کام سے لیکر دیگر گھریلو کاموں کے ساتھ وہ ابتدائی اور

کڑھائی کا کام بھی کرنے لگیں۔

میراں بانو نے دونوں لڑکیوں کے رشتے دو الگ الگ گوترالے قبیلے کے لڑکوں سے طے کر دیئے اور پچیس بھینسوں کا مہر اور پچاس بھینسوں کا جہیز لے دیکر نکاح بھی پڑھوا دیا تھا۔ لیکن چند مہینوں بعد ہی ایک دوپہر سکینہ کے سسرال سے رمضان علی کو سندیسہ بھیج کر بلایا گیا۔

سکینہ کے شوہر قربان علی کو دہرہ دون کے ایک خان صاحب اپنے ساتھ دہلی لئے جا رہے تھے۔ رمضان علی جب اپنے سمدھی کے ساتھ خان صاحب سے مل کر لوٹے تو خاصے مطمئن تھے مگر میراں بانو کو قربان علی کے جانے پر اعتراض تھا اور ازحد افسوس بھی۔

"خان صاحب کوئی اجنبی ہیں برسوں سے ان لوگوں کا دودھ خریدتے رہے ہیں اور پھر قربان علی ابھی بارہ تیرہ برس کا بچہ ہے۔ دلّی میں کوئی نہ کوئی ہنر سیکھ لے گا سینکڑوں کمائے گا۔ خان تھا اب ذمّہ لیتے ہیں۔ رد کی لیتا تو انھیں جنگلوں میں بھینسوں کے ساتھ ہماری طرح زندگی خراب کرتا اور چار آنے سیر دودھ بیچتا رہتا۔ اور کیا کچھ غلط کہا میں نے؟

بڑی سادگی اور پورے اعتماد و یقین سے خان صاحب کے سمجھائے نقطہ کو رمضان علی نے میراں بانو کے سامنے دہرایا تھا۔ میراں بانو نے تو بس

"اللہ جانے اور سکینہ کے نصیب" کہہ کر رمضان علی کی عقلمندی کی داستان ختم کر دی
تھی۔ گر دودھ میں پانی ملانے کو گناہِ عظیم سمجھنے والے سادہ لوح گجروں میں سکینہ کے
نصیب سے شروع ہو کر خان صاحب کی نیک نفسی اور غربا پروری کے تذکرے
کئی دنوں تک چلتے رہے۔ لیکن میراں بانو اپنی جگہ اسی طرح ایک مبہم سا خوف سا
دل میں لیے رمضان علی سے اکثر سکینہ کے مستقبل کے بارے میں اپنی فکریں سناتی
رہتی۔ اور رمضان علی اس کی وہمی طبیعت پر مسکرا کر رہتے۔

"فکر کیسی۔ اللہ پر بھروسہ ہے قربان علی ابھی پلک جھپکتے میں لوٹ
آئے گا۔"

وقت گزرتا رہا۔ گجر قبائلیوں کی زندگی اپنے مقام پر ٹھہری رہی مگر
برسوں کا زمانہ وقت کے ساتھ یوں گزرا کہ اس صدیوں پرانے اسی محور پر مسحور
حیات والے گجر قبیلے میں بہت کچھ بدل گیا۔ جیناں بانو کی رخصتی کر دی گئی اور
سکینہ کو میراں بانو نے قربان علی کی واپسی تک اپنے پاس روکے رکھا۔ رمضان علی
دو بار حج کر آئے تھے اور اب پورے گجر ٹھکانے میں ... پورا لقمن چچیرے
تھے گوجروں کو پوری قانونی اور اخلاقی تحفظ دینا ان کی ذمہ داری تھی۔ اسی لیے
بھری ہوئی رائفل ان کے پاس ہر وقت رکھی رہتی تھی۔

دس بارہ سال کا لمبا عرصہ گزر چکا تھا مگر قربان علی ابھی تک دلی سے

پلٹ کر اس گجر بستی میں نہیں آیا تھا۔ اور نہ ہی خان صاحب دہرہ دون لوٹے تھے سنا گیا تھا وہ دلّی چھوڑ کر بمبئی چلے گئے تھے۔ اور اب بمبئی میں بھی نہیں تھے۔ اس لئے قربان علی کی کوئی خیر و خبر کوشش کے باوجود نہیں مل پائی تھی۔

میراں بانو کو ایک طرف سکینہ کو ابھی تک سسرال نہ بھیج سکنے کا قلق تھا تو دوسری طرف جیناں بانو کو سسرال بھیج دینے کا غم تھا۔ یوں تو خیر سے جیناں بانو اب ماشاءاللہ چار بیٹیوں کی ماں تھی۔ لیکن اس کے اوپر چار سوتیں بھی آچکی تھیں۔ جیناں بانو اپنے شوہر سے قطعاً خوش نہیں تھی۔ اس لیے دونوں ہی لڑکیوں کے لئے میراں بانو گہری سانسیں لیکر آنسو بہاتی اور رمضان علی سے کہتی۔

"قربان علی دیس پردیس گھومتا کہیں مر کھپ گیا ہوگا۔ زندہ ہوتا تو کبھی اپنی خبر خیر بھیجتا۔ سکینہ کا اب دوسرا نکاح کر دو"!

حمایت میں دوسری گجر خواتین بھی نمبردار حاجی رمضان علی سے کہتیں "دیکھو حاجی۔ کھونٹے سے بندھے یہ دودھارو جانور بھی تو بولنے لگتے ہیں سکینہ تو پھر جوان بیٹی ہے"!

مگر ان کی بات پوری ہونے سے قبل ہی حاجی رمضان علی موجودہ صورتِ حال میں سکینہ کا دوسرا نکاح قانوناً شرعاً ناجائز قرار دیکر اٹھ کھڑے ہوتے مگر سکینہ کے گالوں کی سرخی اور بھرے ہوئے جسم کو دیکھتے ہی رمضان علی سہم جاتے۔ ایک

انجانا خطرہ انھیں خوف زدہ کر دیتا۔ راتوں میں سوتے سوتے وہ چونک کر جاگ اٹھتے قرآن کی آیتیں پڑھ کر قربان علی کی واپسی کی دعائیں مانگتے۔ بیچین ہو کر پلنگ پر کروٹیں بدلتے بدلتے وہ قربان علی کے مرنے کی خبر آجانے کی دعائیں مانگنے لگتے۔ رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔ فجر کی اذان سن کر وہ مایوسی کے ساتھ پلنگ سے اٹھ جاتے۔

اس رات بھی نمبردار کی نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ قرآن کی آیتیں پڑھ کر بیچین سے کروٹیں بدلتے ہوئے حاجی رمضان علی نمبردار کو اپنی دیوار کے پیچھے بنے مویشی خانے سے باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیں۔ بستی کے کئی گجروں کی ان دنوں بھینسیں چوری جا رہی تھیں خیال آتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے ہاتھ میں رائفل لیے وہ بجلی کی سی سرعت سے کمرے اور مویشی خانے کی درمیانی دیوار میں بنے گول سوراخ کے قریب پہنچ گئے۔ جھانک کر دیکھا بھینسوں کے درمیان پھیلی چاندنی کے ایک روشن ٹکڑے میں سکینہ کا خوف سے ڈرا سہما چہرہ رمضان علی کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

"بس اب اللہ کا نام لیکر نکل چلو سکینہ نور کے تڑکے ہم یہاں سے بہت دور ہوں گے۔ یہاں رہے تو قیامت تک تمھارے بابا ہمارا نکاح کر دینے پر راضی نہیں ہوں گے۔"

سکینہ کے ساتھ کھڑے نوجوان کے منہ سے نکلے الفاظ حاجی کے کانوں میں انگارے بن کر پڑے سارے بدن سے چنگاریاں سی اٹھنے لگیں ہاتھ میں پکڑی رائفل کی نال انھوں نے سوراخ میں رکھ کر لبلبی دبا دی تھی۔ گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی نوجوان کے منہ سے نکلی چیخ بھی رات کے سناٹے میں گونجتی چلی گئی۔

کچھ بتانا تھا نہ کچھ کہنا۔ واردات خود ہی پورا واقعہ بیان کر رہی تھی۔ ان کے قانون کی رو سے نمبردار کا یہ عمل نہ صرف جائز بلکہ قابل تحسین تھا گجر قبائیلیوں میں رمضان علی کی توقیر کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ لیکن میراں بانو کو نمبردار کے اٹھائے اس قدم کا سخت صدمہ تھا اس کے خیال میں یہ سراسر وحشیانہ حرکت تھی اور کھلے عام چیخ چیخ کر اس نے حاجی رمضان علی نمبردار کو ظالم قرار دیکر بطور احتجاج ان سے آج تک برسوں سے قائم راہ ورسم ترک کر دینے کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ مبہوت کھڑی سکینہ کو لپٹا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

سکینہ کا بازو تھام کر نمبردار نے میراں بانو سے الگ کیا اور اسے لیے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل دیئے۔ پوری بستی میں سناٹا چھا گیا خطاکار نوجوان کی لاش خاموشی سے دفنا دی گئی۔

سکینہ کھلے آسمان کے نیچے ساکت بیٹھی تھی اور حاجی اندر اپنے پلنگ پر پڑے رہے رات گزر گئی فجر سے ظہر کی بھی اذان ہو گئی لیکن نمبردار اسی طرح پلنگ پر لیٹے

رہے۔ چمکتا سورج سر پر سے گزر گیا سکینہ کو جنبش تک نہیں ہوئی۔ عصر مغرب اور پھر عشا کی اذان سن کر بھی حاجی رمضان علی نمبردار پلنگ سے نہیں اٹھے تھے۔ آسمان پر چاند نکل آیا تھا۔ پھیلتی چاندنی کے ساتھ فضا میں خنکی بھی بڑھتی جا رہی تھی لیکن سکینہ اسی بے حسی سے بیٹھی ایک ٹک چاند کو تکتے جا رہی تھی۔ اس کا سارا درد سمٹ کر اس کے ہونٹوں سے نکلا "ہائے ربا"

حاجی چونک پڑے کہیں کانچ ٹوٹ کر بکھر گیا ہے ان کے پوچھنے پر سکینہ قہقہہ مار کر زوروں سے ہنس پڑی تھی اور پھر ہنستی قہقہے لگاتی وہ اٹھ کر میراں بانو کے گھر کی طرف چل دی تھی۔ حاجی اسے پیچھے سے آواز دیتے رہ گئے تھے۔

ساری بستی سکینہ کے دماغ پھر جانے پر افسوس کر کے رہ گئی تھی حاجی نمبردار نے دوا دعا سب کچھ کیا مگر لاحاصل۔ سکینہ اسی طرح قہقہے لگاتی گجروں کی بستی میں گھومتی اور لوٹ کر پھر وہیں میراں بانو کے پاس آجاتی۔ حاجی رمضان علی نمبردار کو نہ تو خاطر میں لاتی اور نہ ہی کبھی ان کے گھر کی طرف جاتی۔ میراں بانو سکینہ کی حالت پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتی افسوس کرتی کہتی رہتی۔

"اے کاش حاجی رمضان علی نمبردار پہلے ہی بات مان لیتے تو کہیں یہ سب کچھ نہ ہوتا۔۔۔ سکینہ سکینہ ہوتی۔"

مگر پھر وہ جلد ہی جیناں بانو کو یاد کرتی اس کی حالت کا ذکر کرتی اور دوسری

گجر خواتین کی زندگی پر غور کرتی اور پھر اسلام اور رسولؐ کے دین کی ارشادات بیان کرتی۔ موجودہ حالات میں گجر خواتین کی زندگی سے غیر مطمئن ہونے کا دیگر عورتوں کو بھی احساس دلاتی۔

میراں بانو کا کہنا تھا۔ طلاق لیکر دوسرا نکاح کر دینے سے جہنم میں جلتی گجر خواتین کی زندگی میں بہشت کے دروازے بھی کھولے جا سکتے ہیں۔ اسی مقصد سے آج کی پنچایت اور بھری برادری کے سامنے وہ اپنی لڑکی جیناں بانو کا مسئلہ لیکر آ کھڑی ہوئی تھی۔ اور نمبردار کے فیصلے کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔

نمبردار اب بھی چپ تھے ان کے سرخ تمتماتے چہرے پر پھوٹ رہی پسینے کی بوندوں نے میراں بانو کا حوصلہ بڑھایا۔

" جاہل گنوار دیکھائی دیتی ہوں نا۔۔۔ مگر ہوں نہیں۔ نمبردار تم اپنے کئے فیصلے کو پھر سوچ لو"۔

میراں بانو نے اپنی بات ختم کر کے پر امید نگاہوں سے نمبردار کو دیکھا وہاں موجود تمام قبائلیوں کی نظریں نمبردار کے چہرے پر ٹک گئیں۔ سب چپ تھے اور اس سناٹے میں نمبردار کے منہ سے کچھ سننا چاہ رہے تھے۔ نمبردار تو خاموشی سے بیٹھے پان چباتے رہے ان کے پاس بیٹھے معمر گجروں میں سے ایک نے اٹھ کر کہا۔

"طلاق تو ممکن نہیں۔ جیناں بانو کے شوہر احمد حسین کے جیتے جی گجر برادری

میں تمھاری بیٹی کا دوسرا نکاح بھی ممکن نہیں۔ نمبردار کے دیئے فیصلے پر اعتراض بھی نہیں سنا جاسکتا۔۔۔ ہاں تمھیں فیصلہ منظور نہ ہو تو میراں بانو تم خود ہماری برادری سے الگ ہو سکتی ہو۔"

معمر گجر کے خاموش ہوتے ہی سارے جہاں کا کرب سمیٹے ایک آواز آئی۔

"ہائے ربّا" اور پھر قہقہہ گونج گیا۔ قہقہے پر قہقہہ سن کر میراں بانو کھڑی کھڑی ساری جان سے لرز گئی۔ جیناں بانو کی سسکیاں بند ہو گئیں۔ تھرتھراتی آواز میں میراں بانو کی بیچارگی بول پڑی۔

"تم۔۔۔ تم اسے زندگی کی جنّت نہیں دے سکتے تو پھر۔۔۔ تو پھر اس کی دوزخ میں اس سے کیوں چھینوں۔۔۔ تمھارا فیصلہ مانے لیتی ہوں احمد حسین جب چاہے جیناں بانو کو لے جاسکتا ہے۔"

احساس کے دو رنگ

میں بڑی خوشی سے تیار ہوگئی دراصل دوسرے قبائیلیوں کے مقابلے میں گھسیا
نامی قدیم باشندوں کے درمیان بہت کم وقت ہم گذار پائے تھے۔ اس لئے جب میرے
شوہر اور ان کے ساتھ کام کرنے والوں نے کچھ وقت ان گھسیا آدی واسیوں کے
ساتھ گزارنے کے لئے مجھ سے کہا تو میں نے فوراً ہی ان کی بات مان لی اور قدیم
باشندوں سے دلچسپی رکھنے والوں کو بصد اصرار اس شام کے لئے مدعو بھی کرلیا تھا۔

خاصے بڑے پھیلاؤ میں بسا ہوا اور قدرتی مناظر سے بھرا پڑا وہ علاقہ دلکش
اور جاذب نظر بھی تھا۔ لہراتی بل کھاتی اونچی نیچی سڑکوں اور چھوٹی بڑی ہری بھری
پہاڑیوں اور اس کے نیچے اوپر آبادیوں کا منظر دیکھ کر ایسا لگتا جیسے ان میں کہیں بھی
انسانی ہاتھوں کی صناعی شامل نہ ہو۔ میں خوش خوش اوپر کھڑی گیسٹ ہاؤس کی
اونچی کھلی چھت سے چاروں طرف کا منظر دیکھ رہی تھی ہرے بھرے پیڑ پودوں سبز
گھاس اور پھولوں سے بھری کیاریوں کے آگے حد نگاہ تک پھیلے مکانوں کے یہ سلسلے
ان کے پیچھے فیکٹری کی چمنیوں سے اٹھتے دھوئیں کی لکیریں ـــ پہاڑیوں کے بیچ
ریل کی پٹریاں ان پر دوڑتے مال کے ڈبے ـــ خوبصورت دائروں کی شکل میں

بکھری پڑی سڑکیں، ان پر سے گزرتے ٹرک بھاگتی پھرتی موٹریں۔ بسیں ان میں سے کچھ بھی بے جوڑ الگ سا نہیں سکتا۔

پہاڑیوں کے پیچھے سے اٹھتا آفتاب کا سرخ گولا اوپر آسمان میں چمک رہا تھا۔ جگہ بہ جگہ دھوپ کے ٹکڑے بکھرے دیکھائی دے رہے تھے۔ نیچے زمین پر لگا پرانا پیپل جس کی تناور ٹہنیاں ہرے بھرے پتوں سے لدی گیسٹ ہاؤس کی اونچی کشادہ چھت کے ایک کنارے پر پھیلی پڑی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا سے اس کے پتے لرزاں تھے وہاں کھڑی میں کبھی ادھر اور کبھی ادھر دیکھ رہی تھی۔

مجھے مطلع کیا گیا "کچھ مہمان آئے ہیں"۔ میں اندر کمرے میں لوٹ آئی جہاں میرے شوہر کے پاس وہ سب بیٹھے تھے ان میں ایک خوبرو خاتون بھی تھیں وہ سب ایک لمبے سفر کے بعد یہاں ہمارے اس آج کے پروگرام میں شامل ہونے آئے تھے۔

تھوڑی سی گفتگو کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ ان خاتون کا نام دنیا ہے اور وہاں موجود ایک صاحب مسٹر سبھاش چندرا کی صاحبزادی ہیں۔ وہ سب اٹھ کر اپنے کمروں میں جا چکے تھے اور میرا بھی موڈ بدل چکا تھا سامنے چھت پر کافی دھوپ پھیل چکی تھی اور ساتھ ہی جھاڑو دینے کی آواز بھی آرہی تھی یقیناً گیسٹ ہاؤس کی صفائی کا وقت ہو گیا تھا۔ اب پیپل کی شاخوں اور ہرے پتوں کے

سامنے جا کر کھڑے ہونے اور چاروں طرف کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کا وہ پہلے جیسا صبح کا سہانا وقت نہیں رہ گیا تھا اس لیے میں اپنے کمرے میں رک گئی میں نے سوچا کچھ دیر بعد جب میرے شوہر اپنی دیگر مصروفیات کے سلسلے میں چلے جائیں گے اس وقت سے دن کے کھانے تک میں اپنا ادھورا ناول پڑھ کر ختم کر لوں گی۔

نہا دھو کر میں آئی تو میرے شوہر جانے کو تیار کھڑے تھے کچھ ضروری ہدایتیں جو آج شام کے پروگرام سے متعلق تھیں۔ مجھے دے کر وہ چلے گئے میں نے ادھورا چھوڑا ناول ہاتھ میں اٹھا لیا۔ کرسی کھینچ کر پنکھے کے نیچے کر لی اور بیٹھ کر صفحے الٹنے لگی اچانک پیچھے سے دینا کی آواز آئی " میں آپ کے پاس بیٹھوں۔؟" میں نے ناول وہیں پلنگ پر رکھ دیا اور اسے اپنے سامنے والی دوسری کرسی پر بٹھا دیا۔ ہم باتوں میں مشغول ہو گئے۔

دن کے کھانے تک ہم ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے اور خاصے بے تکلف بھی ہو چکے تھے خود بخود مجھے یقین ہو گیا کہ یقیناً یہ دو دن کا ہمارا قیام آئندہ اچھی دوستی کا حامل رہے گا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے اندازہ ہو گیا کہ دینا کھلے دل کی وسیع النظر اور تعلیم یافتہ تھی اس کی والدہ کا چھ سات برس پہلے انتقال ہو چکا تھا لیکن دینا کی شادی کے چار سال بعد۔

دینا کی شادی کے فوراً بعد اس کا شوہر امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی
کرنے چلا گیا تھا۔ اس وقت دینا نے بی اے کیا تھا طے یہ تھا کہ دو سالوں کے
اپنے امریکہ کے قیام میں اس کا شوہر اتنا پس انداز کر لے گا کہ آکر دینا کو
لے جائے گا اور نہیں تو دینا کو بلا لے گا۔ کچھ مہینے سب ٹھیک رہا خطوط اور
ٹیلی فون کے سلسلے قائم رہے پھر کم ہوئے اور ایک سال سے پہلے ہی اس کے
شوہر نے خاموشی اختیار کر لی دھیرے دھیرے علم ہوا وہاں کسی امریکن لڑکی
سے اس نے شادی کر لی ہے۔ دینا کو نہ اس نے خود اپنی خیریت بھیجی اور نہ
دینا کی خبر لی اور نہ ہی طلاق دی۔ دینا نے ایم اے کیا۔ پی ایچ ڈی ختم کر لی اور
وہیں یونیورسٹی میں بحیثیت لکچرر تقرری بھی پالی۔ بڑی خاموشی سے دس برس گزر
گئے اور دینا چپ چاپ اپنے کام سے لگی اپنے والد کے ساتھ بیٹھی رہی ہے۔

یہ سب سن کر مجھے افسوس ہوا دینا سے ہمدردی بھی اور اسی ہمدردی
کے جذبے کے تحت میں نے جی بھر کے اس کے شوہر کو برا بھلا کہہ سنایا تھا
میں نے سر سے پیر تک دینا کو بغور دیکھا وہ اچھی خوبصورت اور باشعور لگی جس کا
ہر طرز و انداز سلیقہ مندی لیے تھا نکھرے نکھرے سراپا والی دینا کو دیکھ کر
کہیں سے بھی تو نہیں لگتا کہ اس کے اندر ایسا شدید درد چھپا ہوا ہے اس میں
اس کی باتوں میں شکایت اور نفرت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ احساس اور

زندگی سے بھرپور دینا کو میں پتھر دل بھی نہیں کہہ سکتی۔ وہ سب سمجھتی ہے اپنی زندگی بنانے اور اسے دوبارہ سنوارنے اور نئے سرے سے سجانے کے لیے وہ بہت کچھ کیا سب کچھ کر سکتی ہے مگر کرتی کیوں نہیں؟ آخر وہ ان قانونی اور سماجی اختیاروں سے فائدہ اٹھا کر ایسے نااہل و نالائق برائے نام شوہر سے پیچھا چھڑا سکتی ہے تو پھر آخر کیوں نہیں کرتی یہی میں اس سے پوچھنا چاہتی تھی۔ دیر تک باتیں کرتے ہوئے آخر ہمارے درمیان یہ سوال آہی گیا۔

میرا اصرار تھا اور اس کا انکار۔ میں انکار کا سبب پوچھتی اور وہ ہنس کر ٹالنے کی کوشش کرتی میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ سبب جان کر اسے سمجھانے کی کوشش میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ میرے سامنے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آخر دینا بولی

"میری ممی کو اس بات کا بڑا صدمہ پہونچا تھا۔ وہ بھی مجھ سے یہی چاہتی تھیں جو آج آپ چاہتی ہیں کہ میں کر دوں۔ ممی کو دوسرا بڑا صدمہ پہونچا تھا میرا فیصلہ یا میرا انکار سن کر اور وہ اسی غم میں ختم ہو گئیں۔ ممی چلی گئیں مگر مجھے اپنے اندر یہ نہیں لگا کہ ممی کو میں نے کوئی دکھ دیا ہو جو غم انھیں ملا وہ انھیں میں نے نہیں دیا پاپا نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں کہا اور اب دس دس برس گزر گئے عمر گزر گئی میرے بالوں میں سفیدی چمکنے لگی" دینا نے اپنے سلیقے سے بندھے

بالوں کی طرف اشارہ کیا اور ہنسنے لگی کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ پھر بولی
دیکھئے نا ___ کچھ کرتی تو کیا مل جائے گا۔ ایک اور سرٹیفکیٹ میری کوالی فکیشن
بڑھا دے گا۔ کچھ اور آگے بڑھی تو پھر وہ دوسرا نہ جانے کس رنگ ڈھنگ والا
ہو؟ ذرا سوچئے تو پھر یہی زندگی ہو گی نا میری ___ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور
آگے بولی " بہتر کے بجائے بدتر ہو سکتی ہے۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ میرے
یوں ہی رہنے میں کیا حرج ہے؟" دینا نے اپنی گہری گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا
اور خود ہی کہنے لگی "سچی بات یہ ہے مجھے اپنی زندگی میں کوئی کمی کوئی خالی پن کا
احساس ہوا ہی نہیں میرے دل میں کبھی ایسا کوئی خیال نہیں آتا اور خود سے
میں کچھ اس بارے میں سوچتی ہی نہیں، سوچنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتی۔"

وہ چپ ہو کر میرے سامنے بیٹھی تھی پتہ نہیں کیوں اس کے منھ سے نکلے
ایک ایک لفظ سے چٹانوں جیسے مضبوط عزم کی جھلک مجھے صاف نمایاں نظر آئی اور
ایک سچے صاف کردار کا پیکر دینا کی شکل میں مجھے اپنے سامنے کی کرسی پر دکھائی
دیا۔ لیکن میں یا میرے اندر کی عورت اس کی باتوں سے مطمئن نہیں ہو سکی درد کی
ایک خلش سی مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ دینا نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور ہنس کر بولی

" یہ بڑا خوبصورت علاقہ ہے اور اتنی اونچائی پر سے تو چاروں طرف کا
منظر بڑے غضب کا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ادھر سامنے کی طرف پانی کا ایک تالاب

اور اس کے گرد سیڑھیاں اور نیم دائرے کی شکل والے چبوترے۔ دیکھے ہوں گے نا آپ نے۔۔۔؟"

"ہاں دیکھے تھے صبح"

وہ مجھے اپنی باتوں سے بہلاتی دوسرے بہت سے موضوع پر یکے بعد دیگرے باتیں کرتی رہی۔

سہ پہر کے بعد ہم سب تیار ہو کر گیسٹ ہاؤس سے باہر نکلے چھوٹے موٹے ٹیلوں اور ایسی ہی پر پیچ پہاڑیوں کے درمیان سڑکوں سے گزرتے ہم اس علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں ہندوستان کے قدیم باشندوں کے گھسیا قبیلے نہ جانے کب سے رہتے بستے چلے آرہے تھے دینا میرے پاس بیٹھی تھی۔ دوپہر کی باتوں کا وہ درد اور خلش میرے اندر اب بھی تھی میں نے چاہا اس سے پھر ویسی ہی باتیں کروں اور سمجھاؤں مگر اس نے بات بڑھنے ہی نہیں دی۔ ذکر گھوم پھر کر ان قبائیلیوں کے بارے میں چلتا گیا۔ اپنے اپنے علم کے مطابق تھوڑی بہت واقفیت ہم سب ہی ایک دوسرے کو دے رہے تھے۔ ان کے رومانی لوک گیت اور رقص کی بات آئی تو سب کی رائے میں ان کے لوک گیت بڑے پُر معنی اور ان کی حقیقی زندگی کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ مگر اب اس ترقی کے دور میں وہ خود انھیں بھولتے جائیں گے ان کا مشہور زمانہ رقص کرما اور جھومر میں

رقاص اور رقاصاؤں کے باہمی سوال وجواب کی سادگی اور دل نشینی کی میری طرح خود وینا بھی دلدادہ تھی۔ لیکن سب کو خدشہ تھا کہ جیسے جیسے وہ ہماری مہذب دنیا کے طور طریقوں سے نزدیک آتے جائیں گے ان کے صدیوں پرانے تمدن وکلچر کا دھیرے دھیرے خاتمہ ہوتا جائے گا۔ لیکن محض ان کے آرٹ وکلچر کو محفوظ رکھنے کے لیے انھیں روز بروز ہونے والی ترقی سے الگ بھی تو نہیں رکھا جا سکتا۔ ہم اپنے اطراف سے بے خبر باتوں میں ایسے مشغول ہوئے کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چل سکا کہ کب راستہ طے ہوا اور ہم اپنی منزلِ مقصود پر پہونچ گئے۔

علیحدگی پسند جنگلوں تک محدود اپنی دنیا میں مگن رہنے والے یہ آدی واسی گھسیا قبیلے بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ اس کا یقین ان کے علاقے میں قدم رکھتے ہی ہمیں ہو گیا تھا۔ ہم سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے ان کی اپنی بنائی ہوئی مردنگ زمین پر ایک طرف ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں اور سامنے صاف کھلے پتھریلی زمین کے اس چوکور سے ٹکڑے پر ایک طرف الگ گھسیا قبیلے کے مرد و زن اور بچے بیٹھے تھے۔ صاف ظاہر تھا رقص اور لوک گیتوں کے پروگرام کی تیاری مکمل تھی۔ وینا مجھے دیکھ کر مسکرائی اور میں جواب میں ہنس پڑی تھی۔
اندھیرا پھیل چکا تھا چاروں طرف مشعلیں جلا دی گئیں اوپر کھلے آسمان پر تارے

چمک رہے تھے سیاہ اونچے پہاڑوں پر سکوت تھا اور جنگل میں سناٹا۔ فضا میں خنکی تھی۔ بڑے ڈرامائی انداز میں ایک گھسیا قبائیلی گلے میں مردنگ لٹکائے اور کمر میں گھنگھروں کی چوڑی سی پٹی لپیٹے آگے آگیا دونوں ہاتھوں سے پڑنے والی مردنگ کی تھاپ گونج اٹھی اور ساتھ ہی کئی نوجوان آگئے اور پھر تیزی سے ان کے قدم اٹھنے لگے۔ رنگین ساڑیوں میں لپٹی لڑکیاں بھی آکر رقص میں شامل ہوگئیں ہم سب ان کے لوک گیت اور رقص دیکھنے میں کھوسے گئے فضا میں لوک گیت بکھرے تھے اور نگاہوں کے سامنے تیز رقص اور کانوں میں گونج رہی تھی مردنگ کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار۔ ہمیں ہوش ہی نہیں تھا اور نہ ہی کچھ اور احساس۔ اچانک کسی نے کہا رات کے دو بج رہے ہیں جنگل کے سنسان راستوں سے ہمیں واپس لوٹنا ہے رات اندھیری ہے اور وقت بہت ہو چکا ہے اس لیے اب اٹھنا ہی بہتر ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً ہمیں طے کرنا پڑا کہ ان کا اگلا گیت اور رقص ختم ہوتے ہی ہم سب اٹھ کر واپس چلے جائیں گے۔

ہمارے سامنے کھڑا رقاص اپنی لے میں نغمہ سرا تھا اور گیت کے بول کہہ رہے۔

(فصل نہیں ہوئی لگان معاف ہے ہمارے پاس کھانے کے لیے چاول نہیں ہیں اس لیے مہوے کی شراب نہیں تیار کر کے ہم وہ مہوہ اپنے کھانے

کے لیے رکھ لیں گے مگر لگان وصولی کے کارندے اپنی دستوری کے پانچ سیر مہوہ اور دو بوتل شراب نہ ملنے پر ہتھکڑی بیڑی پہنا کر تھانے اور جیل لے جانے کو دھمکاتے ہیں عجب لاچاری ہے۔ گھبرا کر اگر اندر جنگلوں میں جا کر چھپ جاتے ہیں مگر یہاں آکر بھی ہمیں انھیں بیچین کرنے والے خیال پریشان کرتے ہیں کہ گھر پر ماں اس کے غم میں دن رات روئے گی اور بہن میکے آکر چار مہینے آنسو بہائے گی اس کا بھائی تین مہینے تک اس کے غم میں روتا رہے گا۔ جبکہ بیوی صرف تین دن راہ انتظار دیکھ کر اپنے لیے کوئی دوسرا ڈھونڈ لے گی۔ بیوی کا چہرہ نگاہوں میں گھومتا ہے اور اسی کا غم خون کے آنسو اس جنگل میں بیٹھے بیٹھے دن رات رلاتا ہے)

آگے منشی پیچھے جمعدار

مانگے ایک پسیری مہوا دو بوتل شراب

ہاتھ میں ہتھکڑی پیری گوڑے میں جنجیرا

آدھے کوس پر تھانہ ہے کوس بھر جہل کھانا

جہل جانا پری ہو تو ہے جہل جانا پری

دیکھت کھتا کے داب رے بھیا ہم نکلی گیلی بیترا

مائی روئے ہیں دن چو ماسا رد ئے بہنا

بھائی روئے تین ماس اور مہر تا کی تین دن

کھوجی دوجا آسا رے بھیا کھوجی دوجا آسا

اتِ مہر دیکھی کے روآنسی لاگی ہو روآنسی

آں ہاں ـــــ مہر تا کی تین دن

کھوجی دوجا آسا

اتِ مہر دیکھی کے روآنسی لاگی ہو

روآنسی لاگی ہو

مردنگ کی تیز تھاپ پر وہ سارے رقاص جھوم جھوم کر تیز لے میں اسی بند کو دہرانے لگے۔ نہ جانے کیوں گیت کے ان آخری بند کو سن کر میرا جی چاہا اس کا ردعمل دیکھنے کے لیے وینا کا چہرہ دیکھوں مگر اندھیرا تھا میں نہیں دیکھ سکی لیکن میرے کانوں سے بڑی گہری تاسف سے بھری گرم سانس ٹکرائی میں نے چونک کر اپنے پاس بیٹھی وینا کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا وہ پتھر سی ساکت تھی مگر مجھے درد کی وہی خلش پھر اپنے اندر ابھرتی سی سی محسوس ہوئی جو دوپہر کو اس کی روداد سن کر پیدا ہوئی تھی میرے ذہن میں وینا کے شوہر کا خیال آیا ساتھ ہی صدیوں پیچھے رہ جانے والے آج کے ایک آدی واسی شوہر کا بھی عکس ابھرا۔ دو متضاد تصویریں ایک دوسرے کے برعکس ایک ہی وقت کی دو مختلف زاویۂ نگاہ کی صاف

کھلی پرچھائیاں۔ لیکن ان کا تقابل کروں بھی تو کیسے؟ یہ دو الگ الگ زمانوں کی بات ہوگی۔ ایک بڑے لمبے درمیانی فاصلے والے دو وقتوں کو یکجا کرنا ہو بھی کیسے سکتا ہے مایوسی کی اداسی مجھ پر چھانے لگی میں آگے کچھ اور سوچ نہیں سکی۔ میری آنکھوں میں اپنی ہی بے بسی کے آنسو آ گئے۔ واپس آنے کے لیے سب لوگ موٹروں میں بیٹھ گئے تھے میرا دل چاہ رہا تھا یہاں رک جاؤں اور جھومتے ناچتے گاتے ان سادہ لوح ادی واسیوں سے کہوں اپنے اپنے اچھے گیت کے اس آخری بند کو ایک ایسی آواز میں گاؤ جو آج کے جیتے جاگتے نئے دل و ذہن تک پہونچ سکے مگر میں رک نہ سکی۔ میں معصوم ناچتے گاتے ادی واسیوں سے کچھ کہہ نہ سکی۔ موٹریں اپنے راستے پر آگے بڑھتی گئیں اور جنگل کی سنسان اندھیری رات کے سناٹے میں ہواؤں کے ساتھ بڑی دور تک ان گھسیا قبائیلیوں کا مستی بھرا نغمہ مجھے سنائی دیتا گیا

مہرتا کی تین دن کھوجی دوجا آسارے بھیا

کھوجی دو آسا آں ہاں

اتِ مہر دیکھی کے رو آنسی لاگی ہو

رو آنسی لاگی ہو

"میٹھے بیر"

مئی کے آخری دنوں کے سورج کی تیز شعاعیں تیندو کے اجاڑ کھڑے بے برگ درختوں پر پڑ رہی تھیں۔ ساری پتیاں جھاڑی جا چکی تھیں کہیں کوئی پتی باقی نہیں رہ گئی تھی جو سہ پہر کی دھوپ اور تپش سے بچنے کے لیے تھوڑا سا یہ دیتی ــــــ لیکن سائے اور ٹھنڈی ہوا کی کبھی کوئی آس نہ رکھنے والے کول قبائلی مزدور غول در غول لنڈ منڈ کھڑے تیندو کے درختوں کے درمیان یوں گھومتے پھر رہے تھے جیسے چاندنی رات ہو۔ مشقت کے پسینے سے بھیگی انکی ہتھیلیوں میں چند سکے دبے تھے جو کئی ہفتوں کی ان کی کڑی محنت کا صلہ تھے۔ اپریل سے مئی تک کی لو دھوپ میں جھلسے سیاہ بدن پر صرف ایک چھوٹی سی دھوتی لپیٹے یہ سارے انسان۔ نہیں کول آدی واسی آج ٹھیکے دار سے اپنا حساب پا چکے تھے کتنی اجرت کس کو ملتی ہے اس کا پورا اختیار ٹھیکے دار کی مرضی پر منحصر ہوتا جس کا نہ کوئی اصول تھا اور نہ اس پر کسی ضابطے کی بندش۔ خود مختار ٹھیکے دار کی صورت میں وہ در اصل ان کا رازق ہوتا جو سال کے اسی موسم میں ہر سال اس علاقے میں آتا لیکن کنارہ کشی علیحدگی اور روپوشی کی ان کی زندگی نے کول قبائیلیوں کو اتنا حوصلہ ہی کب

دیا۔ جو بہ زبان کھولتے اور اپنے حق محنت کے صحیح حصول کے طلبگار ہوتے وہ تو بس جو کچھ مل گیا۔ اسی پر قانع لاپرواہ اور بے پرواہ بنے عورتوں مردوں اور بچوں کی ٹکڑیاں بنائے دھیرے دھیرے اپنی بستیوں کی طرف جا رہے تھے۔ ان سے الگ اونچے تپتے ہوئے پتھر پر رامنتی اسی طرح بیٹھی تھی۔ اسے اجرت کے پیسے نہیں مل سکے تھے ٹھیکے دار سے اسی سلسلے میں اسے بات کرنی تھی۔

پان کی پیک تھوک کر ٹھیکے دار نے رامنتی کو پھٹکارا اور پھر وہ اپنے پھوس کے بنے اسی جھونپڑے میں جاکر پھر روپے پیسے گننے اور سمیٹنے میں لگ گیا۔ پان کی اس سرخ پیک پر نگاہیں جمائے بیٹھی رامنتی کو نہ جانے کتنی دیر ہو چکی تھی۔ مارکین کی دھوتی میں لپٹے آبنوس کے مجسمہ جیسا رامنتی کا سیاہ پیکر بے حس و بیجان سا ہو کر رہ گیا تھا۔ کافی دیر بعد سر اٹھا کر اس نے سامنے کھڑے لنڈ منڈ تیندو کے درختوں کو دیکھا۔ گہری ٹھنڈی سانس لیکر رامنتی نے سوچا بارش ہوتے ہی ان پیڑوں میں نئی کونپل اور ہری پتیاں پھوٹ نکلیں گی جو برسات سے جاڑوں تک پنپ کر خوب چکنی اور سڈول ہو جائیں گی اور اگلی گرمیوں میں تیار ہو کر اس لائق ہو جائینگی کہ ٹھیکے دار پھر یہاں آکر ان کی قیمت لگا کر جنگلات کے محکمے سے ٹھیکہ پالے گا اور پھر اس گرم موسم میں قبیلے کے چھوٹے بڑے عورت مرد اور بچے بچے میں گرمی آجائے گی تیندو کی پتیاں گرانے کا کام پالینے کا جوش سا امڈ آئے گا۔ سادہ لوح

تنگ دست کول قبائیلی مزدور کے لیے پورے سال میں محض ایک بار یہ واحد ذریعۂ معاش اور اس کا حاصل دراصل اس کی مجبوری اور کمزوری ہے جو خود بخود ٹھیکے دار کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے جائز و ناجائز کا امتیاز سمجھ لینے کی صلاحیت ادی واسی کول میں تو کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ انھیں صرف ٹھیکے دار کی خوشنودی پالینا ہی مقصود ہوتا۔ رامنتی بھی کب پیچھے ہٹی تھی۔ اس کے ساتھ نہ جانے کتنی گرمیاں گزارنے کے بعد ٹھیکے دار کی نگاہیں رامنتی کے پیچھے کھڑی اس کی بیٹی بانسنتی پر رکیں اور وہ پان سے سرخ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بول اٹھا

"دیکھ رامنتی تیندو کی سوکھی پتی کے بعد نئی کونپل کو بڑھنے پھیلنے دے۔ ہاں بانسنتی کو بھیج اب"

رامنتی کو سمجھتے دیر نہیں لگی کہ وہ اب تیندو کا ایسا بے برگ درخت ہے جس کی سبزی و شادابی لوٹ کر نہیں آئے گی۔ لیکن بانسنتی ایک ہرا بھرا پودا بن گئی جس کی پتیوں پر ٹھیکے دار کی نگاہیں پڑ گئی ہیں۔ تیندو کی جھاڑی ہوئی پتیاں سمیٹ کر اس نے دو حصوں میں باندھ لیں۔ ایک بوجھ بانسنتی کے سر پر رکھ کر دوسرا اس نے خود اپنے سر پر رکھ کر کول ادی واسی بستی کی طرف قدم بڑھائے۔ ٹھیکے دار نے پیچھے سے آواز دیکر اسے روکا اور پھر قریب آکر کچھ روپے رامنتی کے ہاتھ پر رکھ دیے اور ایک پرمعنی ہنسی اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ گردن ہلا کر

رامنتی نے اثبات میں جواب دیکر سامنے دیکھا۔ باسنتی کے پیچھے اس کی دونوں چھوٹی لڑکیاں کانتی اور کلونتی دوڑتی چلی جارہی تھیں۔ بالکل ایسے جیسے قطار در قطار تیندو کے چھوٹے بڑے ہرے ہرے پودے جنگل میں جابجا لگائے گئے ہوں۔

کول بستی میں دوپہر کی تیز دھوپ پھیلی تھی۔ کول قبائیلی اپنے اپنے جھونپڑوں کے اندر تھے جہاں بیٹھے بیٹھے دوپہر سے سہ پہر تک پتیاں باندھنے کے کام میں پورا خاندان لگا ہوتا۔ رامنتی کی تینوں بیٹیاں تیندو کی بیس بیس پتیاں گن کر ایک کے اوپر دوسری پتی رکھ کر گڈی باندھنے کے لیے ماں کو دے رہی تھیں۔ اور رامنتی ان کے گرد تاگا لپیٹ کر بڑی نفاست سے ٹوکرے میں سجا کر انھیں رکھتی جارہی تھی مگر تھوڑی دیر بعد اس کے ذہن میں ٹھیکے دار کے کہے ہوئے الفاظ آکر گھومنے سے لگتے اور نگاہوں کے سامنے لنڈ منڈ تیندو کا پیڑ اور ایسے ہی پیڑوں کا جنگل آجاتا۔ اور پھر خود اس کا پیکر اور جنگل کے اندر آئندہ کے لیے لگائے گئے تیندو کے نرم و سبز پودے ــــ لڑکیاں اسے پکارتیں تو وہ چونک کر سنبھل جاتی اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوجاتی۔

سہ پہر کو ٹھیکے دار کے پڑاؤ پر پھر چہل پہل ہوجاتی ادی داسی مرد و زن اہلکاروں کو گن گن کر تیندو کی پتیوں کی بندھی ہوئی گڈیاں دیتے اور پھر منتی

کے رجسٹر میں ان کا اندراج ہوتا جاتا۔ پھر منشی حساب کر کے ان کی اجرت کے پیسے لکھ کر پرچی ان کے حوالے کرتا جاتا۔ اسی پرچی پر ٹھیکے دار بذاتِ خود ان کی ادائیگی کرتا۔ پتیوں کی گڈیاں وہیں کھلے میدان میں سوکھنے کے لیے رکھ دی جاتیں۔ اچھی طرح سے سوکھنے پر وہ گڈیاں گن گن کر بوروں میں بھر دی جاتیں اور بورے ٹرک میں بھر کر گوداموں تک پہونچائے جاتے۔ جہاں کچھ وقت رو کنے کے بعد انھیں بیڑی بنانے والے کارخانوں کو فروخت کر دیا جاتا۔

راسنتی نے اپنی گڈیاں گنوا کر پھر منشی سے اجرت کی پرچی مانگی جواب میں پھر منشی کے چہرہ پر ایک مکروہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ادھر ادھر نگاہ ڈال کر وہ آہستہ سے بولا "رات کو لے لینا آکر آج تو باسنتی ادھر مالک۔" ٹھیکے دار کے جھونپڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پھر منشی نے راسنتی کا چہرہ دیکھا۔

راسنتی نے چونک کر یوں سر اٹھا کر اسے دیکھا جیسے پھر منشی نے کہا ہو وہ نہیں تیندو کے درخت میں جھاڑنے کو ابھی پتیاں ہیں۔"

پھر منشی ہنس کر بولے

"جا ادھر بوروں میں گڈیاں بھر دے بہت کام رکا پڑا ہے۔ ہٹ

پیچھے اوروں کو آنے دے۔"

غربت اور پھر روزگار کا دوسرا وسیلہ نہ پانے والے کول آدی واسی سب کچھ جانتے ہوئے بھی آنکھیں بند رکھتے ہیں پورے سال میں صرف ایک بار ہی تو چند ہفتوں کے لیے کچھ کما کھا لینے کا موقع ملتا ہے جس سے شادی اور گونا جیسے بڑے خرچ والے سارے کام نپٹ جاتے ہیں۔ پھر سوچنا کیا ہے۔ جنگلوں میں آباد اور عام دنیا سے کنارہ کش یہ کول آدی واسی اپنے سلسلۂ نسب کو شری رام چندر اور شیبری سے ملاتے ہیں۔ چودہ سالہ بن باس کے عرصہ میں شری رام کو جھوٹے بیر کھلانے والی شیبری بھلنی سے ہونے والی اولاد کول کہلاتی ہے۔ جو جنگلوں میں پھیلتی بڑھتی گئی کاشت کے لیے نہ زمین ہے اور نہ ہی کوئی اور وسیلۂ روزگار۔ مرغیاں پالنا آس پاس کی آبادیوں میں تھوڑے غلّہ اور معمولی اجرت پر کھیتوں میں کام کر کے روزی روٹی پیدا کرنا ان کے لیے آسان نہیں ہوتا۔

رامنتی دوسری عورتوں کے ساتھ بستی میں لوٹی تو اندھیرا ہونے لگا تھا بسنتی کھانا پکا چکی تھی اور سامنے بیٹھے باپو کے لیے چلم بھر کر ان پر انگارے رکھ رہی تھی۔ رامنتی نے ٹوکرے ایک طرف ڈال دیئے اور وہیں زمین پر بیٹھ گئی اس کے شوہر کوشن نے ہاتھ میں حقہ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"پیسے ملے؟"۔

"نہیں" رامنتی نے سر ہلا کر کہا۔

"پرچی"؟

"نہیں"

"پھر جانا ہے"؟

"ہاں" رامنتی نے سپاٹ جواب دیا۔

لیکن رامنتی کو نہ کچھ کہنا پڑا اور نہ سمجھانا باسنتی نے اپنے آپ سمجھ لیا تھا اور ٹھیکے دار نے بڑی بڑی رقمیں رامنتی کو ادا کر دی تھیں۔ پھر منشی اور پڑاؤ کے دوسرے چھوٹے اہلکاروں نے رامنتی کے بغیر کچھ کہے سنے حسب مقدور اپنی اپنی ادائیگی بھی کر دی تھی۔

کوشل اور رامنتی جب بھی اپنے دکھ سکھ کی باتیں کرتے تو تینوں لڑکیوں کے ہونے سے انھیں ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہوتا۔ زندگی کی لمبی ڈگر پر ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری بیٹی سہارا دے گی۔ دونوں بیٹیوں کے بعد تیسری کو کچھ زیادہ دن روک کر تب گونا کریں گے تاکہ بڑھاپے میں کچھ دن آرام رہے۔ یہی ارادہ گویا ان کے مستقبل کا سارا پلان تھا۔

بستی کی دوسری بیٹیوں کی طرح باسنتی کے بعد کانتی ٹھیکیدار پھر منشی اور دوسرے اہلکاروں کی طرف ہوتی ہوئی آخر میں اپنی اپنی سسرال گئی تھیں مگر اب کلونتی کے وقت میں رامنتی پریشان تھی ایک طرف تو خود رامنتی اب

ساری پتیاں گرا دینے کے بعد سوکھا بے برگ تیندو کا درخت تھی دوسری طرف کلونتی اس کی تیسری بیٹی سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے بھی تیندو کا وہ پودا نہیں بننا چاہتی تھی جس کی پتیاں ہر قیمت پر گرالی جاتی ہیں۔ اگر ماں کچھ اسے سمجھاتی تو وہ الٹے ماں کو سمجھانے لگتی۔ کوشل تو ہمیشہ ہی ایسے معاملات میں خاموش رہتا۔ کول بستی کے دیگر آدی واسیوں کی طرح وہ بھی پورے سیزن تک اپنی بیوی اور بیٹیوں کی طرف سے پیٹھ کیے آج بھی بیٹھا ہوا تھا مگر خود بہو اور بیٹیاں اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی روادار نہیں تھیں انھیں اس دستور سے انکار تھا جس کیلئے ان پر کافی سختی بھی کی گئی لڑکیوں اور بہوؤں کو بے دردی سے پیٹا گیا مگر سب بے سود۔ سبھی قبائیلیوں کا خیال تھا کہ ان کی لڑکیوں کے اس طرح ماتھے پھر جانے کا کارن بستی کے آس پاس کھلے نئے نئے اسکول ہیں۔ جن میں یہ سب پڑھنے جاتی رہی ہیں۔

ٹھیکے دار کا پڑاؤ ابھی اس علاقے میں دو دن اور تھا اس سیزن میں آدی واسیوں کی آمدنی خاصی کم تھی۔ پتا پاس بہنوں کے ناموں کے ساتھ رامنتی کا بھی نام پھڑ منشی کے رجسٹر میں لکھا ہوا تھا جو اپنی ہی سوچوں میں گم اسی تپتے پتھر پر اب بھی بیٹھی تھی۔

پھڑ منشی اس کے قریب آکر بڑے ناصحانہ انداز میں فضول خرافات

اٹھانے سے باز رکھنے کی ہدایت دینے لگا۔ بڑی بے بسی سے رامنتی نے پھر منشی کو دیکھا جو بے تکان بول رہا تھا۔ رامنتی اس کی باتوں کو صحیح مان کر سر ہلاتی رہی جیسے کہہ رہی ہو۔ اسے کب انکار ہوا۔ دونوں بڑی بیٹیاں حسب دستور اس کے پیچھے پیچھے چلتی چلی آئیں مگر یہ تیسری بیٹی کلونتی اپنی راہ الگ جا رہی ہے اسکول کی ہوا لگ گئی ہے نا اسے کچھ نہیں سنتی"۔

شام ہو چلی تھی رامنتی اٹھ کھڑی ہوئی اور سر جھکائے بستی کی طرف چل دی۔ رامنتی نے دیکھا اس کی ہم عمر بستی کی کئی دوسری عورتیں بھی سوکھے منھ اور تھکے قدموں سے لوٹ رہی ہیں۔ کیا کیا جائے یہ سب لڑکیاں اب اسکول والیوں کے سامنے اپنی ماں کی بھی نہیں سنتی ہیں۔ ناحق انھیں پڑھنے اسکول بھیجا تھا۔ رامنتی دل ہی دل میں پچھتاتی گھر میں داخل ہوئی۔ سوکھا سہا کوشل بیٹھا چلم پھونک رہا تھا اور اندر کلونتی توے پر روٹی ڈال رہی تھی۔

اندھیرا پھیل چکا تھا کول بستی میں سناٹا تھا۔ رامنتی نے دھیرے سے پکارا۔

"کلونتی"

"ہاں اماں"

"جا"

"نا نہیں ۔ نہیں"

"ہٹ نہ کر"

"نہیں اماں"۔

اچانک کوشل نے اٹھ کر دو تین طمانچے کلونتی کے منھ پر جڑ دیئے ساتھ ہی گالیوں کی ایک تیز بوچھار بھی کی۔ مگر کلونتی اپنی جگہ سے نہیں اٹھی کوشل غصہ میں بکتا جھکتا جھونپڑے کے باہر نکل گیا۔ رانتی بیٹی کے پاس آکر بیٹھ گئی اور خود بھی رونے لگی۔ اندھیرے میں ماں اور بیٹی دونوں کی دبی دبی سسکیاں ابھرتی رہیں۔ کچھ دیر بعد کلونتی کو قائل کرنے کی غرض سے رانتی نے کول آدی واسیوں کی وہی پرانی روایت دہرانی شروع کی۔

دیکھ بیٹی شبری بھگوان رام کے پاس میٹھے بیر لیکر گئی۔" ہاں گئی پر کیا ملا۔ ہم ان کے ونشج کول کہلائے جنگل میں بھولے بھٹکتے پھرنے کو۔ آج تک سب کو بھگوان اور راجہ کا روپ مان کر۔" "چپ" کوشل کی سخت آواز اندھیرے میں آئی اس نے پھر کلونتی پر ہاتھ چھوڑا اور بہت دیر تک مارتا پیٹتا رہا تھا۔

آس پاس کی کئی جھونپڑیوں میں یہی ہوا۔ کول قبائیلیوں کے لیے یہ ایک انہونی سی بات تھی اس سے نہ صرف والدین بلکہ لڑکیاں بھی بہت پریشان

تھیں۔ دوسرے دن ساری دوپہر منھ بسورتی آنسو بہاتی لڑکیاں سر جوڑے اس آفت سے چھٹکارہ پانے کی ترکیبیں سوچتی رہیں۔ خاصی پریشانی تھی سب ٹھیکے دار سے پیسے وصولنے کی فکر میں بھی تھیں اور اسے سبق بھی سکھانا چاہتی تھیں۔ بہت دیر سرگوشیاں کر لینے کے بعد وہ سب کی سب منتشر ہو گئیں۔

رامنتی نے سہ پہر سے لیکر اب تک نہ جانے کتنی خوشامدیں ٹھیکے دار پھر منشی اور اہلکاروں کی کی تھیں مگر کسی پر کچھ اثر نہیں ہوا وہ یوں ہی مایوس بیٹھی سوچ رہی تھی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ کہیں سے اس کا شوہر کوشل پکار پکار کے اس سے کہہ رہا تھا وہ گھر جارہا ہے۔ دونوں ہتھیلیاں گھٹنے پر رکھ کر وہ اٹھ گئی۔

رامنتی کو دیکھتے ہی کوشل بولنے لگا اس کا غصہ منھ سے نکلتے الفاظ کے ساتھ بڑھتا گیا۔ اپنی غریبی سے شروع ہو کر وہ کلونتی کے بیاہ اور پھر اب گونے کے خرچ تک آگیا تھا اسے خدشہ تھا کہ اگر یہ دو راتیں ضائع گئیں تو پھر کچھ نہیں ہو پائے گا ٹھیکے دار واپس چلا جائے گا اور اس کے بعد بڑا اکھڑنے لگے گا تیندو کی پتی سے بھرے کئی ٹرک تو جاچکے اب بہت کم بورے باقی بچے تھے اور آج شام کو تو آدی واسیوں کا کافی حساب بھی صاف کر دیا گیا لیکن ان کا حساب ابھی رکا پڑا ہے۔ اسے رہ رہ کر غصہ آتا کہ کلونتی ان کی مجبوری

کیوں نہیں سمجھتی ہے بلکہ سب سمجھتے ہوئے بھی کیوں ناسمجھی کر رہی ہے۔
تاؤ میں آکر اس نے کلونتی کو سنایا کہ تھوڑی دیر بعد اگر وہ نہ گئی تو کل سے
بھی زیادہ اس کو آج مارے گا۔ ڈراتے دھمکاتے اور پھر بیدردی سے
پیٹنے کی بار بار کی آگاہی سن کر آخر کلونتی بولی "باپو اندھیرا ہونے دو ـــ
نہ جاؤں تب!"

اندھیرا ہو چکا تھا کلونتی کے پیچھے پیچھے جا کر کوشل نے اطمینان کر لیا
تھا کہ وہ صحیح جگہ پہونچ گئی ہے۔ واپس آکر وہ بیٹھا چلم پی رہا تھا اور گہرے
سکون کی سانس لیکر رامنتی سے باتیں کر رہا تھا" ہاتھ کھلتے ہی کلونتی کا گونا کرنا
ضروری ہے۔ یہ لڑکی بہت ٹیڑھی اور ہٹ دھرم ہے اسے روکنا ٹھیک نہیں ہوگا
پتی جھاڑ کر جو کچھ روکھی سوکھی ملے گی زندگی گزار لینا ٹھیک ہے مگر کلونتی۔
نہیں اسے آگے یہاں رکھنا نہیں اچھا ہوگا۔"

اسی وقت اندھیری جھونپڑی میں کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔
رامنتی نے زور سے پوچھا۔

"کون"؟

"اماں" ہانپتی ہوئی کلونتی بولی۔

"کلونتی"؟ کوشل اور رامنتی ایک ساتھ بولے انھیں اس کے جلدی

لوٹ آنے پر حیرت تھی۔ کوشل غصہ میں اٹھا مگر کلونتی اس سے پہلے ہی ہانپتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

" اماں ۔۔ کل صبح جانا پھر منشی تمھارا حساب چکتا کر دے گا ۔۔ ہاں ٹھیکے دار نے اسے بول دیا۔ میرے سامنے پوری بستی کی لڑکیوں کے سامنے ۔۔ لے یہ اتنے نوٹ اس نے دیئے تھے " کلونتی نے روپے بڑھاتے ہوئے کہا۔

دوسری صبح اپنا حساب لینے رامنتی اور کوشل ٹھیکے دار کے پڑاؤ پر گئے لیکن ان کے پہونچنے سے پہلے ہی کلونتی اور اس کے ہمراہ بستی کی بہت سی اس کی ہم عمر لڑکیاں وہاں پہونچ گئی تھیں۔ پھر منشی بڑی تیزی سے ایک ایک کول قبائیلی کا حساب دے رہا تھا نہ جانے کیوں پڑاؤ کے سارے اہلکار بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ پڑاؤ کے باہر کھڑی ٹیکسی میں ٹھیکے دار کا سامان بندھا ہوا تھا۔ یہاں آنے پر رامنتی اور کوشل کی طرح دوسرے آدی واسیوں کو بھی معلوم ہوا کہ زیادہ نشہ کر لینے سے رات ٹھیکے دار پھسل کر پتھر پر گر پڑا جس سے اسے بہت چوٹیں آئی ہیں۔ ٹھیکے دار کے قیام کے لیے بنائے گئے جھونپڑے کے اندر اور باہر بہت سے کنکر اور ٹوٹی ہوئی لکڑیاں بکھری پڑی تھیں۔ دو آدمی سہارا دیکر ٹھیکے دار کو باہر ٹیکسی میں بٹھانے کو لے آ رہے

تھے سامنے کھڑی لڑکیوں میں کسی کی آواز بڑی صاف سنائی دی۔

"ٹھیکے دار بیچارہ میٹھے بیروں کے بجائے اتنی چوٹیں کھا گیا" لڑکیوں کی ہنسی کے جل ترنگ بج اٹھے۔ ان کے سامنے سے نیچی نگاہیں کیے خاموشی سے ٹھیکے دار آگے بڑھ گیا۔

"دردِ دل کے واسطے"

"اللہ" پھر وہی اکیلاپن" یہ تنہائی بھی کیا بری شئے ہے اور وہ بھی اس پہاڑی گیسٹ ہاؤس کے اندر۔ احساس کی شدت اچانک بڑھ گئی تھی جس سے گھبرا کر میں کھلے دریچے کے سامنے کھڑی ہوگئی تھی۔ سامنے پہاڑیوں پر بڑی بڑی بوندیں گر رہی تھیں اور بادل امنڈتے چلے آرہے تھے۔ بجلی بڑی زوروں سے چمکی تھی اور میں نے دیکھا وہ کمال مشاقی سے سامنے والی پہاڑی پر قدم جماتی چڑھتی چلی جارہی تھی۔ اس کے قیمتی سبز شال پر گرتی بوندوں کے گول گول دھبے مجھے دکھائی دے رہے تھے۔

" تو وہ اس موسم میں بھی نہیں رکی" میں اپنے آپ سے کہہ اٹھی تھی دس دنوں سے وہ روز مجھے اس پہاڑی پر چڑھتی نظر آتی اور پھر انھیں پہاڑیوں میں کہیں گم ہوجاتی اور گئی رات میں واپس لوٹتی تو اس کے ساتھ آئے لوگوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں ہمیں گہری نیند میں چونکا دیتی تھیں اور کئی بار صبح سویرے اسے تنہا لوٹتے ہوئے بھی میں دیکھ چکی تھی یقیناً وہ کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔ اس وقت بھی اس کے لیے میں اپنی نفرت کو نہیں روک

سکی تھی۔

آخر یہ روز جاتی کہاں ہے ؟ ان پہاڑیوں کے پیچھے تو ہندوستان کے قبائیلی باشندے کولٹا ہریجن اور خاصہ راجپوت بستے ہیں جو عام دنیا سے کنارہ کشی اور علیحدگی کی زندگی بسر کرتے ہیں یہ سارا علاقہ اور پہاڑیاں ان کے پیچھے آباد قبائیلی بستیاں جنھیں میں صبح و شام اپنے شوہر کے ساتھ ٹہلتے گھومتے دیکھ چکی تھی۔ دہرہ دون کے اس علاقے جولنسار کی طرح اس کے یہ قبائیلی باشندے بھی بہت خوبصورت تھے اور خصوصاً کولٹا عورتیں جنھیں میں نے سیڑھی دار کھیتوں میں کام کرتے جانور چراتے اور سر پر بھوسے کے بڑے بڑے بوجھ اٹھائے انھیں پہاڑیوں میں اترتے چڑھتے دور دور سے دیکھا تھا۔ اس طرف یوں قیمتی لباس اور زیورات پہن کر روزانہ جانے میں آخر اس عورت کی کیا مصلحت چھپی ہے ؟ غریب کولٹاؤں کو اپنی امارت دکھانے کیوں جاتی ہے یہ ان کی بستیوں میں لیکن مجھے کیا ؟ میں کیوں سوچ سوچ کر اپنا دماغ خراب کروں اور وہ بھی دلکش قدرتی مناظر سے بھرے اس پہاڑی علاقے میں ؟۔

یہ خوبصورت پہاڑی علاقہ مجھے بے حد پسند تھا یہاں دو تین ہفتے گزارنے کی برسوں سے میری خواہش تھی۔ اسی لیے اپنی فرم کے کام سے

آتے ہوئے میرے شوہر مجھے بھی ساتھ لیتے آئے تھے۔ نئی برانچ قائم کرنے کے ابتدائی کاموں میں ہی دو ہفتے گزر گئے تھے اور جتنا کام ابھی باقی تھا اس کے لیے ایک ہفتہ انھیں یہاں اور رکنا تھا۔

ہمارے قیام کی جگہ ڈیہرہ دون اور اس کی شہری آبادی سے خاصی دور تھی۔ لیکن فرم کی قائم کردہ نئی برانچ سے قریب۔ اسی لیے ہم یہاں ٹھہرے تھے دوسرے تین ہفتوں کے لیے اس سے سستی اور آرام دہ کوئی اور قیام گاہ ہمیں مل بھی نہیں سکی تھی۔

یہاں آنے کے دو ہی دن بعد مجھے گیسٹ ہاؤس میں اکیلے سارا دن گزارنا دشوار لگنے لگا تھا اس لیے جب چوکیدار نے بتایا کہ اس پاس کے خالی پڑے دوسرے سوٹ میں بھی جلد ہی لوگ آنے والے ہیں تو مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی اور میں نے اپنے شوہر سے کہا تھا "آنے والے اپنے بال بچے بھی ساتھ لیتے آئیں تو کتنا اچھا ہو زندگی کی رونق کے سامنے تنہائی کی کوفت ختم ہو جائے گی۔"

اس دوپہر باہر کچھ ہلکا ہلکا سا شور سن کر میں فوراً سمجھ گئی تھی کہ کوئی آیا ضرور ہے آنے والوں کو ایک نظر دیکھ لینے کے لیے میں کمرے سے نکل کر کھلے باہری برآمدے میں آگئی تھی۔

وہ ٹیکسی سے اتر کر دوسرے سوٹ کی طرف جا رہی تھی مجھے دیکھتے ہی وہ رکی، اخلاقاً مسکرائی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی "نمستے" اور پھر تیزی سے اپنے کمرے کے اندر چلی گئی تھی۔ مگر میں خوش تھی۔ دراز قد، سرخ و سفید رنگت اور خوبصورت ناک نقشے والی اس باوقار عورت کے لباس اور انداز صاف بتا رہے تھے کہ وہ کسی بہت بڑے گھرانے کی ہے۔ مگر ساتھ ہی خوش اخلاق بھی اسے دیکھ لینے کے بعد مجھے پورا یقین تھا اور بڑی تسکین تھی کہ میری وہ بوریت اَب ختم ہو جائے گی جو میرے شوہر کے کام پر چلے جانے کے بعد دس بجے دن سے شام کے پانچ بجے تک مجھے گھیرے رہتی تھی۔

اس کے ساتھ اور کوئی نہیں آیا تھا۔ چوکیدار اس کا سامان اٹھا کر اس کے کمرے کے اندر پہونچا آیا تھا۔ جہاں اب چوکیدار کی بیوی اس کا سامان لگا رہی تھی اور وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی میں نے سامنے کی کھلی کھڑکی سے دیکھا تھا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ مجھے سامنے پہاڑیوں پر جاتی نظر آئی تھی۔

اکیلے ہوتے ہوئے بھی سارا دن میں خوش تھی۔ شام کو میں نے اپنے شوہر سے اس کی اتنی تعریفیں کی تھیں کہ وہ میرے اتاؤلے پن سے چڑھ گئے تھے مجبوراً اب مجھے باتوں کا موضوع بدلنا پڑا تھا۔

دوسرا دن بھی گزر گیا مگر وہ میرے پاس نہیں آئی تھی اور پھر کئی دن گزر

گئے مگر وہ مجھ سے ملنے نہیں آئی۔ بیش قیمت زیورات اور ساڑیوں میں ملبوس پہاڑیوں پر جاتے ہوئے میں ہر صبح اسے دیکھتی اور پھر وہ سارا دن واپس نہیں لوٹتی تھی۔ ہر صبح وہ اسی پہلے والے انداز میں رک کر اخلاقاً مسکراتی اور ہاتھ جوڑ کر "نمستے" کہتی اور تیزی سے آگے بڑھ جاتی اور پھر پہاڑیوں میں گم ہو جاتی اور میں اپنے آپ کچھ خجل سی ہو اٹھتی۔ میری مایوسی اور خجالت پر میرے شوہر خوب ہنستے۔

دن کی تنہائی میں اس عورت سے متعلق معمولی باتیں بھی مجھے سوچنے پر مجبور کرتی رہتی تھیں۔ جیسے اس کے ساتھ اور کوئی کیوں نہیں آیا ہے۔ وہ اکیلی بمبئی سے آئی ہے مگر کیوں؟

قیمتی زیورات اور لباس پہن کر وہ ان غریب کوٹا بستیوں میں کیا کرنے ہے؟ ایسے بہت سے سوال مجھ سے جواب مانگا کرتے اور سوچ سوچ کر بھی ان باتوں کا کوئی جواز میں تلاش نہیں کر پاتی۔ یہ سوچیں الجھنیں بن کر مجھے مجبور کرتیں کہ میں اس کے بارے میں کسی سے کچھ دریافت کروں لیکن یہاں تو چوکیدار کی بیوی کے سوا کوئی دوسری عورت ہے ہی نہیں اور وہ اس کا خاص خیال رکھتی ہے۔

آخر اس دن میں چوکیدار کی بیوی سے پوچھ ہی بیٹھی تھی۔

"اوہ ـــ وہ سیٹھانی وہ تو ایسے ہی بستیوں میں گھوما کرتی ہیں۔ کئی سال سے

برابر انھیں دنوں آتی ہیں۔ مگر کہہ رہی تھیں کہ اس بار سیٹھ جی آئیں گے دو چار روز رکیں گے اور پھر انھیں کے ساتھ یہ بھی بمبئی واپس لوٹ جائیں گے۔"

اس کا جواب کوئی خاص اطمینان بخش معلومات مجھے نہیں فراہم کر سکا تھا اور وہ عورت اور اس کا ان کولٹا بستیوں میں روزانہ غائب رہنا میرے لیے بدستور ایک معمہ بنا رہا اور میں اپنی تنہائیوں میں اس معمہ کا حل سوچا کرتی۔

ایک شام دہرہ دون سے آئے ایک دوست نے باتوں کے دوران ہمیں بتایا کہ عسرت غربت اور پھر پشتینی قرضوں کی ادائیگی کے لیے یہ جولنساری کولٹا ہریجن تو اپنی، بیٹی، بہن اور ماں تک کو بڑی معمولی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں اور پھر بھی نہ تو قرض ادا کر پاتے ہیں اور نہ ہی پیٹ بھر روٹی کھا پاتے ہیں اور لطف یہ کہ ان کی بیچی ہوئی عورتیں بڑھاپے میں یہیں اپنے گھروں کو لوٹ آتی ہیں تو ایک آدھ زیور یا تھوڑی سی نقدی کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔"

"انھیں خریدتا کون ہے؟" میرے شوہر کا سوال تھا۔

"خریدار تو ہر بڑے شہر سے یہاں آتے رہتے ہیں وہی بازارِ حسن کے ..... کہتے کہتے وہ مجھے دیکھ کر رک گئے تھے۔

مگر کئی دنوں سے دماغی الجھن دینے والے اس معمہ "صنف عورت" سے متعلق سارے سوالوں کے جواب مجھے مل گئے تھے۔ ہوں تو یہ عورت بھی اسی غرض سے آئی ہوئی ہے اور اسی لیے روزانہ کو لٹ بستیوں کو چل دیتی ہے۔ ساتھ ہی مجھے چوکیدار کی بیوی کی بات یاد آگئی "خوب" میرے منھ سے نکلا وہ عورت یہاں پچھلے کئی سالوں سے آرہی تھی اور اس بار توان کا سیٹھ بھی آنے والا ہے۔ تو گویا خرید و فروخت کا اچھا بزنس پھیلا رکھا ہے جو لنسار سے بمبئی تک" میں کانپ کر رہ گئی۔

مجھے اس عورت کے تصور سے بھی اب کراہیت اور نفرت پیدا ہو رہی تھی۔ عورت ہو کر وہ عورت کی عظمت و وقار کو یوں کھلے بازار لٹا رہی تھی میں نے طے کر لیا تھا اب اس کی "نمستے" کا بھی جواب نہیں دوں گی۔

لیکن اس کے بعد وہ کئی دنوں تک مجھے نہیں ملی۔ بس دور دور سے پہاڑیوں میں چڑھتی اترتی رنگ برنگے زرق برق لباس میں مجھے دکھائی دیتی رہی تھی۔ اچھا ہے وہ دور ہی دور رہے۔

میرے شوہر کا کام اب ختم ہو رہا تھا دو دن بعد ہمیں واپس دہلی جانا تھا۔ مگر ہم کچھ وقت دہرہ دون میں بھی گزارنا چاہتے تھے۔ اس لیے کل صبح ہم یہاں سے جانے والے تھے۔ میں اپنا سامان سمیٹ رہی تھی پورے کمرے میں

بے ترتیبی سے الٹا پلٹا سامان اور دوسری چیزیں بکھری پڑی تھیں۔

"نمستے" میں اس کی آواز سن کر چونک گئی تھی سامنے مسکراتے ہوئے وہ ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ نفرت حقارت اور غصہ سے میرا دل بھرا ہوا تھا۔ میں نے چاہا اسے کھڑے کھڑے کمرے سے باہر نکال دوں۔ مگر وہ اطمینان سے چلتی ہوئی نزدیک آئی اور دونوں ہاتھوں سے پلنگ پر پھیلی چیزوں کو ہٹا کر بیٹھ گئی اور بولی "آپ جا رہی ہیں"؟

میں چپ تھی مگر وہ پھر بولی۔

"میں تو آپ کے پاس کسی دن آ بھی نہیں سکی۔ دراصل مجھے وقت ہی نہیں ملا۔ دن رات کولٹ بستیوں میں لگی رہی پھر بھی صرف ڈیڑھ سو لڑکیاں اور پچاس عورتیں بڑی مشکل سے مجھے مل سکی ہیں اور آج رات تو سیٹھ جی آجائیں گے بقیہ سارے کام وہ آسانی سے کرلیں گے۔"

اس کی اس ڈھٹائی اور بے غیرتی کے ساتھ کھلے اعتراف پر مجھے بڑا طیش آیا۔ میرے غصہ کی پرواہ کیے بغیر اس نے ایک دعوت نامہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ کیا"؟

میرے سوال پر وہ ہنس پڑی۔

وہ پڑھ کر دیکھئے" وہ مسکراتی گئی۔

کارڈ پر لکھے حروف چمک اٹھے۔

کولٹا بچیوں اور عورتوں کی تعلیم گاہ اور دستکاری

کی تربیت گاہ کا افتتاح وزیراعلیٰ کے دستِ مبارک....

میں آگے پڑھ نہیں سکی تھی۔ سارے الفاظ ہوا میں تیر رہے تھے نہیں شاید مجھے چکر آ گیا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں اس سے کیا پوچھنا چاہتی تھی اور کیا کہہ گئی تھی مگر وہ اسی اطمینان اور خوشی سے کہہ رہی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ میں بمبئی سے آئی سیٹھانی تو ہوں مگر تھی اسی بستی کی ایک کولٹا ہریجن لڑکی جسے اس کے باپ نے برسوں پہلے بڑے معمولی داموں پر بیچ ڈالا تھا اور پھر کئی ہاتھوں میں بکتی اور کئی شہروں میں خریدی گئی میں اپنے اس آخری خریدار ان سیٹھ صاحب کے ہاتھ آئی تھی جنھوں نے خریدا تو مجھے اپنے بزنس میں کام آنے کے لیے تھا مگر رکھا مجھے اپنی بیوی بنا کر۔ دیکھئے ہر سال یہاں بمبئی سے اتنی دور مجھے اپنے میکے بھیجتا ہے کئی سال پہلے وہ مجھے لیکر یہاں آیا تھا تو میرے لیے بڑی سی کوٹھی بنوا گیا تھا اور اب وہ اسی کوٹھی میں کولٹا عورتوں اور بچیوں کے لیے ٹریننگ سنٹر کھلوا رہا ہے میں نے اس سے کچھ نہیں مانگا۔ مگر وہ میرے دل کا حال سمجھتا ہے۔ وہ دیوتا ہے دیوتا۔ کل ان سے

مل کر اور کھول ڈالیں کر آشیر واد دیکر جائیے گا۔"

دیر تک وہ خاموش میرے سامنے بیٹھی تھی اور پھر "نمستے" کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی جا چکی تھی اور میں اس کا دیا ہوا "دعوت نامہ" دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے اب بھی بیٹھی تھی۔

"فریبی"

دن چھپنے سے قبل ہی تانگی (چھوٹی بیل گاڑی) تھارد گاؤں کے نزدیک پہونچ چکی تھی۔ اپنے باپ فقیرا اور بھائی رمیش کے پیچھے بیٹھی برکتی کو خیال ہوا گاؤں میں آج سناٹا ہے ورنہ جیتی جاگتی تھارو زندگی کی رونق اور چہل پہل سے شام ہونے کا احساس گاؤں کے باہر ہی سے ہو جاتا تھا۔ "کیا اس کے نہ رہنے سے اتنا کچھ بدل گیا ہے"؟ خاموش بیٹھی برکتی نے اپنے آپ سے پوچھا تو ضرور لیکن پیچھے اٹھتے غبار اور تانگی میں لگے گھنگھروؤں کی چھم چھم اور بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کے سوا کوئی آواز نہیں ابھری جو اس کے سوال کا جواب دیتی۔ سسرال جانے سے پہلے اپنے میکے کے اس تھارد گاؤں کی شام اسے یاد آگئی۔ جس میں چولہوں سے اٹھتے دھوؤں کے درمیان ٹمٹماتے چراغوں کی ملگجی روشنی میں پلنگوں پر بیٹھے تھارو بے فکری سے باتیں کرتے ہوئے چلم پیتے ہوتے تھے فضا میں ابلتے چاولوں میں مچھلی اور تیل کی بو ہوتی عورتوں اور بچوں کی ہنستی بولتی آوازیں ہوا کرتی تھیں۔ مگر آج یہ سب کہیں کچھ نہیں تھا۔ برکتی کے دل کو ایک دھکا سا لگا تھا۔

گاؤں کے اندر جا کر تانگی رک گئی تو تقریباً ہر جھونپڑے سے گود میں بچے لیے عورتوں بہوؤں اور بیٹیوں نے نکل کر برکتی کو گھیر لیا تھا سب اس سے باری باری گلے مل رہی تھیں اور نو عمر لڑکیاں اس کے گہنے دیکھ رہی تھیں اپنوں کے درمیان کھڑی برکتی کے اندر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ رہی تھی۔

تین طرف قطار سے ملے جلے جھونپڑوں سے گھیرے ہوئے لمبے سے آنگن میں چاندنی بکھری تھی۔ جہاں مٹی اور گوبر سے لیپے ہوئے کچے صاف فرش پر چٹائیوں۔ کتھریوں اور دری کے بستر بچھا کر تھارو قبائیلی عورتیں اور بچے پاس پاس لیٹے تھے تھوڑا سا الگ ہٹ کر تھارو قبائیلی مرد بان کے پلنگوں پر دری بچھا کر لیٹے سو رہے تھے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ برکتی کے ساتھ باتوں میں مشغول سبھی تھارو قبائیلی عورتیں سو چکی تھیں مگر برکتی جاگ رہی تھی۔ وہ سوچ میں ڈوبی چپ چاپ پڑی تھی۔ بستی کی ساری گزری باتیں وہ سن چکی تھی جس میں سب سے نمایاں بات تھی فصلوں کی۔ بارش نہ ہونے سے اس پورے سال کوئی فصل پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جس کا پوری بستی کی خوشحالی پر برا اثر پڑا تھا۔ زندگی میں پہلی بار برکتی کے قبیلے کو فاقوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا یہ سب سن کر برکتی کا دل رو رہا تھا وہ بستر پر پڑی سوچ رہی تھی اور سوچتے سوچتے نہ جانے کب سو گئی تھی۔

صبح جب برکتی کی آنکھ کھلی تو دھوپ پھیل چکی تھی۔ جھونپڑوں کے اوپر پھیلی لوکی کدو اور تروئی کی مرجھائی بیلوں میں کھلے مرے مرے سے سفید اور زرد پھولوں پر نگاہ پڑتے ہی اسے رات کی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ گاؤں میں زندگی جاگ اٹھی تھی مگر بڑی بے کیف اور بیزار کن زندگی بچوں کے رونے اور کھانے کے لیے بلکنے کی آوازیں آرہی تھیں اور جواب میں ماؤں کی گھڑکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ خود اس کا باپ فقیرا بڑے بھائی رمیش سے کہہ رہا تھا۔

"اٹھ جلدی کر۔ ہل توڑ کر لکڑیاں ماں کو دیدے۔ وہ چولھا جلا کر ناشتے کے لیے "نمکین بھات" ابال دے گی دیکھ نا میں مہاجن سے نمک اور چاول لے آیا ہوں برکتی کے ساتھ سبھی کھالیں گے۔"

باپ کی باتیں سنتے ہی برکتی کو پھر ایک دھکا سا لگا بارہ مہینوں دھان سے بھری کوٹھاریوں والے اس کے گھر کی اب یہ حالت ہے۔ وہ سوتی ہی رہتی تو اچھا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اٹھ کر بیٹھ تو گئی تھی مگر عجیب دل شکستہ سی۔

دن کے اجالے میں برکتی اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ گاؤں کے باہر کھڑی دیکھ رہی تھی بستی کے چاروں طرف میلوں تک پھیلے خود ان کی کاشت کے کھیت سوکھے اجاڑ پڑے تھے۔ اور ان کے پیچھے حد نگاہ تک ہرے بھرے

جنگل کے گھیرے تھے جنھیں کانٹے دار تاروں کو بلیوں میں باندھ کر اور اس کے باہر موٹی جالیوں کی فنسنگ دیکر چاروں طرف سے گھیر دیا گیا تھا اور اندر جگہ جگہ چوکیدار شوٹنگ گارڈ پہرہ دیتے رہتے۔ اگر کسی طور تھارو جنگل میں پہونچ بھی جاتے تو پکڑ کر سیدھے افسروں تک لے جائے جاتے جو جنگل اجاڑنے کے جرم میں جیل بھیج دینے کو کہتے اور پھر دو سو سے پانچ سو روپے جرمانہ ادا کرنے پر چھوڑ دیے جاتے۔ جرمانے کی رقم بنجارے مہاجنوں سے سود کی بھاری دروں پر جس آسانی سے حاصل ہو جاتی اس کی ادائیگی میں اتنی ہی آسانی سے تھاروؤں کے ہاتھ سے ایک دو کھیت بھی نکل جاتے۔

برکتی کے لیے یہ ساری باتیں نئی تھیں۔ وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ آخر یہ جنگل والے کب اور کیسے ان جنگلوں کے مالک بن بیٹھے۔ انھیں جنگلوں میں مہارانا پرتاپ کے ساتھ دیگر تمام راناؤں نے پناہ پائی تھی۔ یہیں تھارو نسل نے جنم لیا۔ اور جنگلوں تک محدود دنیا بنائے تھارو اپنے پرانے طرز رہائش اور قدیم تمدّن و نظام زندگی پر پرسکون اور خاموش دن گزارتے صدیوں سے چلے آ رہے تھے مگر اب؟ گہری سانس لیکر خاموش کھڑی برکتی نے سوچا "ابھی زبردستی ہے — اس کا جی چاہا تھاروؤں کے جنگل سے اس جنم جنم کے رشتوں کو ختم کرنے والوں کا منھ نوچ لے۔

برکتی کو ماں نے آواز دیکر کھانے کے لیے بلایا۔ گیہوں کا ابلا دلیا کھانے کو اس کا دل نہیں چاہا مگر سب کے اصرار پر وہ بیٹھ گئی۔ لکڑی نہ ملنے کی وجہ سے روٹی نہیں پکائی جاتی تھی۔ تھوڑا بہت کھا کر وہ پھر واپس لڑکیوں کے پاس آگئی تھی۔ اب ان کے ساتھ معمر عورتیں بھی باتوں میں شامل تھیں ساری دوپہر وہ سب کے ساتھ پلنگوں پر بیٹھی جنگل والوں کی زیادتی کے قصے سنتی رہی۔ جنگل کے اس نئے عذاب سے چھٹکارا پانے کی ترکیبیں سوچتی رہی جس سے قبیلے کو کچھ راحت ملے۔

برکتی کو سسرال سے میکے آئے کئی دن گزر چکے تھے مگر بستی کے تمام قبائلیوں کو اب بھی فاقوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ قدرت کے بھروسے جنگلوں میں آباد ان تھارو قبائیلیوں کی زندگی کا مکمل انحصار محض خود کاشت پر ہے اس سال بارش نہ ہونے سے اس پورے علاقے میں قحط تھا اور قحط کی زد میں آئے ایسے ہی ایک تھارو گاؤں میں فقیرا کا بھی خاندان بستا تھا برکتی فقیرا کی بڑی بیٹی تھی جس کی پیدائش کے موقع پر اس پورے قبائلی علاقے میں فصل بہت اچھی ہوئی تھی اور بنجارے تاجر اور ساہوکاروں نے اس سال قرض کی وصولی میں سود چھوڑ کر محض اصل رقم کے عوض ہی تھاروں سے دھان لیے تھے۔ اڑتی اڑتی خبر تھی ایسا کرنے کی وجہ نیا قانون تھا مگر تھاروؤں کی قدامت پسند قبائلی زندگی نے فقیرا کی نوزائیدہ بیٹی کو مبارک اور بابرکت سمجھا اسی وجہ سے اس بچی کا نام برکتی

رکھا تھا۔

برکتی نے عمر کا جو حصّہ اپنے میکے میں گزارا اس میں بارش بھی خوب ہوئی تھی اور فصلیں بھی بڑی اچھی ہوا کرتی تھیں علاقے کی خوشحالی بڑھتی ہی رہی تھی۔ مگر جب بیس کوس دور ایک ایسے ہی دوسرے "تھارو ہاٹ" میں برکتی بیاہ کر چلی گئی تو گویا اس علاقے کی ساری خوشحالی اور برکتیں بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی تھیں۔ اس کے سسرال پہونچنے کے چند دنوں بعد ہی جنگل کے محکمے نے خاص طور سے بلا کر اس کے شوہر کو چوکیداری کی نوکری دیدی تھی اور پھر علاقے میں خوب بارش بھی ہوئی اور فصلیں پہلے سے بہت اچھی ہوئی تھیں ان باتوں نے برکتی کا مبارک قدم ہونا ثابت کر دیا تھا اور میکے کی طرح سسرال میں بھی برکتی برکتوں کا باعث سمجھی جانے لگی تھی۔ اب سسرال والے برکتی کو اس کے میکے بھیجتے ڈرتے تھے کہ مبادا یہاں کی ساری برکتیں لوٹ کر برکتی کے ساتھ اس کے میکے نہ چلی جائیں اس لیے برکتی سسرال میں رہتی رہی۔

اُدھر میکے کے "تھارو داس" میں پانی کی ایک بوند بھی نہ برسی۔ خشک سالی سے پوکھرے گڈھے اور تالاب بھی سب ہی سوکھ چکے تھے جس سے مچھلی کیکڑے تو کیا پینے کا پانی بھی ملنا دشوار تھا پھر بھلا دھان گیہوں اور آلو وغیرہ کی فصلیں کیا ہوتیں۔ دوسرا ستم یہ ہوا کہ اس علاقے کا سارا جنگل نیشنل پارک

بن چکا تھا۔ جس سے صدیوں سے جنگلوں کے سہارے زندہ رہنے والے یہ قبائیلی تھارو اب لکڑی مچھلی کیکڑے شکار اور جنگلی پھل پھول سے بھی مکمل طور پر محروم ہو چکے تھے ان تمام محرومیوں کا سبب سارے گاؤں کی سمجھ میں صرف برکتی کا یہاں سے چلا جانا تھا۔ اس لیے مجموعی طور پر تھارو قبائیلیوں کی رائے تھی کہ اب برکتی کو میکے لانا چاہیے تاکہ قبائیلی بستی کی یہ مصیبت دور ہو جائے آخر فقیرا اور رمیش چھوٹی بیل گاڑی لیکر گئے اور برکتی کو میکے لے آئے تھے۔

یہاں صورت حال یہ تھی کہ جنگل کا محافظ عملہ تھاروؤں سے سخت پریشان تھا اور خود تھارو جنگل کے محافظ عملے سے اور پھر ان کے یہ جکڑا دینے والے قاعدے قانون نے تو تھاروؤں کے ان جنگلوں سے صدیوں پرانے سارے رشتے ہی یک لخت منقطع کر دیئے تھے اس لیے اب تھاروؤں کے پاس کوئی کام رہ ہی نہیں گیا تھا اس سارے عذاب سے چھٹکارا پانے کی ہر کوشش کی طرح ان کا برکتی کو واپس میکے لانا بھی سعیٔ لاحاصل ثابت ہو چکا تھا ہر طرف سے مایوس ہو کر تھارو اب دن بھر اپنی بستیوں میں پلنگوں پر بیٹھے اپنے ساتھ ہوئی زیادتیوں کے قصے دہرایا کرتے یا نئی ترکیبیں سوچا کرتے۔ اپنے قبیلے کے تمام افراد کی طرح اب برکتی بھی مغموم اور بیزار سی ہر وقت راحت پانے کی ترکیبیں سوچا کرتی۔

آخر ایک دن دھوپ ڈھلتے ہی برکتی چند معمر تھارو عورتوں کے ہمراہ

جنگل کے گیٹ میں داخل ہوگئی۔ محافظوں کی زور دار پھٹکار سے بظاہر لاپرواہ مگر اندر اندر خوف زدہ ہوتے ہوئے بھی ان لوگوں نے لکڑیاں اکٹھی کر ہی لیں۔ اب باہر لے جانے کا مرحلہ درپیش تھا۔ گیٹ سے لیکر نکلنے میں پکڑے جانے کا خدشہ تھا اس لیے برکتی نے فینسنگ کے اوپر سے اچھال اچھال کر لکڑیاں باہر سڑک پر پھینکنی شروع کیں۔ ابھی وہ آدھی لکڑیاں بھی پھینک نہیں پائی تھی کہ ایک آواز گونج گئی "ٹھہر تو چوٹی کہیں کی اور ساتھ ہی پیچھے سے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا تو برکتی ساری جان سے لرز اٹھی۔ اس کے ذہن میں ایک تیز کرنٹ سا لگا "تو پکڑی گئی" ڈر کر اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

"میں بڑی دیر سے تم لوگوں کو جنگل میں گھومتے دیکھ رہا تھا پہلے ہی سمجھ گیا تھا گھسی ہو تو چوری کروگی ضرور" کہتا ہوا پیچھے سے اس کا ہاتھ پکڑنے والا گھوم کر اس کے آگے آکھڑا ہوا تھا۔

"ارے اتنا ڈر گئیں میں تو" ـــ کہہ کر پکڑنے والا ہنس پڑا تھا۔ اس کے بدلتے لہجے پر چونک کر برکتی نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے خاکی وردی میں ملبوس کندھے سے رائفل لٹکائے شوٹنگ گارڈ مہر سنگھ کھڑا تھا اور اس کے ساتھ کی ساری عورتیں بھاگ کر غائب ہو چکی تھیں۔ ہنستے ہوئے مہر سنگھ بولا۔ "اچھا یہ جلو جلدی کر دو پھینک دو باہر یہ باقی لکڑیاں اور تم بھی بھاگ جاؤ نہیں تو کوئی

اور پکڑلے گا تمھیں"۔

برکتی ہاتھ میں لکڑی لیے کھڑی کانپتی رہی اور خود مہر سنگھ نے اٹھا اٹھا کر لکڑیاں باہر پھینک دیں اور بولا۔

"آؤ اب تمھیں بھی گیٹ کے باہر کر دوں نہیں تو بیکار میں کوئی اور مصیبت تمھارے سر کھڑی ہو جائے گی"۔

ڈری سہمی برکتی مشینی انداز میں اس کے ساتھ چلتی گئی راستے بھر مہر سنگھ اس سے باتیں بناتا گیا اور آخر میں بولا چپ کیوں ہو گیا مجھ سے ناراض ہو گئی ہو؟"

مگر اسے جواب دیئے بغیر خاموشی سے چلتی برکتی سڑک پر آ گئی تھی اور مہر سنگھ گیٹ پر کھڑا اس کے لہراتے لہنگے اور بوٹے دار سیاہ اوڑھنی کو دیکھتا رہ گیا۔

اگلے دن برکتی کے دل سے خوف اور مایوسی کا اثر زائل ہو گیا اور اس کی سوچ میں نیا خیال تھا کیوں نہ مہر سنگھ کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا جائے اس لیے دھوپ پھیلتے ہی اس نے پھر عورتوں کے ساتھ جنگل کا رُخ کیا۔ پھر تو یہ روز ہونے لگا جنگل میں برکتی مہر سنگھ سے باتیں کرتی ہوئی کسی بھی طرف اس کے ساتھ نکل جاتی اور گھنٹوں بعد لوٹتی اس درمیان اس کے ساتھ آئی عورتیں تیزی سے لکڑیاں جمع کرتیں اور باہر پھینک چکی ہوتیں۔ ادھر فینسنگ کے پار پہلے سے کھڑی ہوئی ان کی بیل گاڑیوں میں بھر کر تھارو لکڑیاں لیکر بستی میں واپس بھی

پہونچ جاتے۔

یہ جو کچھ ہو رہا تھا تھاروؤں کی روایت کی رو سے غلط تھا اور بہت بُرا بھی۔ کیوں کہ مہر سنگھ تھارو قبیلے کا نہیں تھا۔ میکے آئی تھارو لڑکی کو پوری جنسی آزادی حاصل ہوتی ہے مگر قبیلے کے باہر تھارو لڑکیاں آنکھ اٹھانا بھی پسند نہیں کرتی ہیں مگر اس وقت تھارو مصلحتاً خاموش تھے ایک تو فی الحال پہلے جیسی ساری سہولتیں تھاروؤں کو جنگل سے دستیاب تھیں دوسرے کچھ ہی مہینوں بعد برکتی کو سسرال واپس جانا تھا۔ اس لیے مزید سوچنا بھی نہیں تھا دن اسی طرح مزے سے گزر رہے تھے۔

ایک صبح ابھی مہر سنگھ پڑا سو رہا تھا۔ رینجر کی اچانک آمد کا شور اٹھا اور پھر اسے حاضر ہونے کا حکم ملا اور جب مہر سنگھ نے حاضر ہو کر سلوٹ دیا تو رینجر صاحب فرما رہے تھے۔

"مہر سنگھ سنا ہے اس علاقے سے جنگل کی لکڑیاں روزانہ باہر لیجائی جا رہی ہیں"؟

"نہیں۔ نہیں سرکار۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا ایسا ہو سکتا ہے"۔

ٹھیک ہے جاؤ۔ اب آج دیکھتا ہوں" کہتے ہوئے رینجر صاحب کی نگاہیں مہر سنگھ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"ارے سرکار اگر ایسا ہوا تو پکڑ کے حاضر کر دوں گا" بوٹ بجا کر مہر سنگھ نے زور دار سلوٹ دیا تھا۔

مہر سنگھ واپس آکر اپنی ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد تھارو عورتیں جنگل میں آگئیں۔ روزانہ کی طرح آج بھی برکتی اس کی طرف چلتی چلی آرہی تھی مگر مہر سنگھ نے اسے دور ہی سے للکار کر زوردار ڈانٹ بتائی۔ ساتھ کی ساری عورتیں ڈر کر بھاگ گئیں مگر برکتی وہیں رک کر لکڑیاں اٹھانے اور باہر کی طرف پھینکنے لگی تھی۔ مہر سنگھ نے پھر کڑک کر کہا۔

"نہیں مانے گی ٹھہر تو تجھے پکڑ کر ابھی رینجر صاحب کے پاس لے چلتا ہوں۔"

برکتی نے سمجھا مہر سنگھ اسے ستانے اور چڑھانے کے لیے یوں ہی چلا رہا ہے۔ اس لیے اس نے طے کر لیا تھا وہ بھی آج مہر سنگھ کو عاجز کرنے گی آخر یہ اپنے آپ کو سمجھنے کیا لگا ہے۔ ادھر مہر سنگھ کو برکتی سے زیادہ اس وقت اپنی نوکری بچانا تھی۔ اس لیے اس نے تیسری بار پھر برکتی کو ڈانٹا تھا۔ اس کی ڈانٹ کا کوئی اثر برکتی پر تو نہیں ہوا ہاں کئی دوسرے چوکیدار ضرور اس طرف آگئے اور سامنے رینجر صاحب کا اردلی بھی چلا آرہا تھا۔ اس لیے بصد عجلت مہر سنگھ آگے آیا اور برکتی کو پکڑ کر رینجر صاحب کے سامنے لے گیا اور بولا۔

"سرکار اور تو سب بھاگ گئیں یہی ایک پکڑ میں آئی ہے"۔
برکتی کو وہیں چھوڑ کر مہر سنگھ واپس چلا گیا۔

جب برکتی سے اس کے گاؤں اور باپ و بھائی کا نام پوچھ کر ایک چوکیدار کو انھیں فوراً بلا لانے بھیج دیا گیا اور برکتی کو وہیں روکے رکھا گیا تو اسے حالات کی سنجیدگی کا احساس ہوا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے مہر سنگھ تھاروؤں کے مقابلے میں بڑا بزدل اور حقیر لگا جو موقعہ پڑنے پر اسے مصیبت میں پھنسا کر خود الگ ہو گیا تھا۔ تھارو مردوں کا تو یہ شیوہ نہیں ہوتا وہ تو ساتھ لگا ہر بات کا مقابلہ مردانگی سے کرتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے برکتی نے طے کر لیا کہ وہ ہر بات رینجر صاحب سے صاف صاف بتا کر مہر سنگھ کو بھی اس کی دغابازی کا مزا چکھائے گی مگر جب وہ بولنا چاہتی تو لگتا اس کے گلے میں کچھ اٹک گیا ہے اور وہ بول نہیں سکے گی اپنی ہمت سمیٹنے اور بولنے کی کوشش کرنے میں کافی وقت نکل گیا۔ چوکیدار اس کے باپ فقیرا اور بھائی رمیش کو لیکر واپس بھی آگیا تھا۔

رینجر صاحب نے انھیں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"چوری کی سزا تو یہی ہے کہ پولیس کے حوالے کر کے جیل بھیج دیں مگر دو سو روپے جرمانہ ادا کرنا ہو تو چھوڑ دیں"۔

پہلے تو فقیرا اور رمیش چپ کھڑے رہے آخر رمیش بولا۔ "چھوڑ دو صاحب

بندوبست کرکے روپیہ پہونچادیں گے "

فقیرانے بھی بیٹے کی تائید کی۔

" ہاں صاحب روپیہ پہونچادیں گے چھوڑ دو "

دل میں غم و غصّہ اور نفرت لیے خاموش بیٹھی برکتی مزید ضبط نہ کر سکی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ تو رینجر نے اس سے پوچھا

" لڑکی تمھیں کچھ کہنا ہے کیا ؟"

" ہاں " اقرار میں برکتی نے سر ہلایا۔

" کہو "

" صاحب " بڑی مشکل سے برکتی کی آواز نکل سکی تھی۔

" صاحب — تمھارے یہاں مرد نہیں ہوتے۔ وہ — وہ تمھارا مہر سنگھ بھی مرد نہیں ہے فریبی ہے پکّا فریبی — " کہتے کہتے برکتی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بھجّا شکاری

فضا میں لوبان اور اگر بتیوں کی تیز خوشبو پھیلی تھی پیپل کے نیچے کھڑا "بھرّا" (جھاڑ پھونک کرنے والا) اونچی آواز میں منتر پڑھ رہا تھا۔ عمل شروع کرنے سے پہلے وہ دیوتاؤں سے خود اپنی سلامتی اور حفاظت کے لیے دعا مانگ رہا تھا۔ دن بڑا روشن اور چمکیلا تھا۔ لیکن سناٹے میں گونجتی بھرّا کی آواز نے عجیب سا پر ہول ماحول پیدا کر دیا تھا منتر ختم کر کے بھرّا نے پھول کی چمکتی تھال پر چند دانے جو کے ڈالے گھی کا چراغ روشن کیا۔ نہا کر پہنی نئی دھوتی کو ایک ہاتھ سے سنبھالتا ہوا اور دوسرے ہاتھ میں پھول کی سجی تھالی لیکر بھرّا آہستہ آہستہ قدموں سے شانتی کے نزدیک آ کر رک گیا۔

سر کے کھلے بالوں اور بے ترتیب کپڑوں میں وحشت زدہ شانتی زمین پر بیٹھی تھی۔ بڑی سختی سے اس کے دونوں بازوؤں کو گاؤں کے مکھیا نے پکڑ رکھا تھا بھرّا نے پھر منتر شروع کیے پھر تھالی کو تین بار شانتی کے سر پر گھمایا۔ بڑی زوروں سے چیخ اٹھی شانتی۔ تھالی میں رکھا چراغ بجھ گیا تھا۔ بھرّا نے جو کے دانے شمار کیے جن کی تعداد کم ہو گئی تھی۔ ساری علامتیں آسیب کی موجودگی کا اظہار کر رہی

تھیں۔ پھر انہوں نے سامنے جمع عورتوں مردوں اور بچوں پر ایک نظر ڈالی ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھالی ایک طرف رکھ دی۔ پھر گاؤں کے پردھان کو مخاطب کر کے شانتی کے آسیب زدہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ بھوکسا قبائیل کے عقیدے کے مطابق آسیب اتارنے کے لیے اب اسے سب سے پہلے شکار کے دیوتا بھجّا شکاری کی پوجا کرنا تھی۔

جنگلوں میں آباد ان قبائیلی لوگوں کا ماضی شاندار رہا ہے ان کا کہنا ہے کہ جب دھارانگری کے راجپوت راجہ جگت دیو اپنے خاندان کے تمام بہادروں کے ساتھ مغلوں کے ہاتھوں میدانِ جنگ میں مارے جا چکے تھے تو ان کی رانیاں اور دیگر شاہی خاندان کی عورتیں اپنے وفادار نوکروں کے ساتھ نینی تال کی ترائی کے جنگلوں میں بھاگ کر پناہ گزیں ہو گئی تھیں۔ رفتہ رفتہ جنگلوں میں زندگی نے اپنے قدم جما لیئے تو رانیوں کے سامنے راج کماریوں کی شادی کا سوال ایک مسئلہ بن گیا جنگل میں ساتھ آئے وفادار ملازموں کے سوا دوسرا کوئی متنفس نہ تھا مصلحتِ وقت اور تقاضۂ زندگی کے تحت رانیوں نے راج کماریوں کا بیاہ نوکروں کے لڑکوں سے کر دیا مگر اس پہچان کے ساتھ کہ زن و شوہر ہونے کے باوجود رانی اور خادم کا لحاظ قائم رہے چنانچہ نینی تال کی ترائی میں الگ دنیا بسائے ہوئے ہندوستان کے قدیم باشندے "بھوکسا" آج بھی اپنے کو راجپوت اور راجہ جگت دیو کی اولاد بتاتے ہیں۔ اور بھوکسا سماج میں عورت کی وہی پوزیشن برقرار ہے۔

ان کی ذاتی زندگی میں شوہر دخل انداز نہیں ہوتے۔ ان کے پشتوں سے چلے آئے تمدن و تہذیب اور مذہبی عقیدہ پر مہذب دنیا کا کوئی اثر نہیں ہے تعصب سے بے نیاز سادہ لوح بھوکسا کی نظر میں مصیبت کی وجہ دیوتاؤں کی ناراضگی ہے اور ہر بلا اور آفت سے بچاؤ حاصل کرنے کے لیے ان کے پیر اور ان کے اپنے منتر ہوتے ہیں۔ ترائی میں بھوکسا قبیلے نے تھوڑی تھوڑی دور پر گاؤں بسا رکھے ہیں۔ زراعت اور مویشی پالنا ہی ان کا ذریعۂ معاش ہے۔ غلّہ کے عوض تمام تر ضروریاتِ زندگی شہروں سے بنجارے تاجر انھیں بہم پہونچاتے رہتے ہیں۔

نینی تال کی تلہٹی میں آباد ایسے ہی ایک قبائیلی گاؤں کے پردھان کی بڑی بیٹی شانتی تھی جس کی شادی کچھ برس پہلے پاس کے گاؤں میں نرائن سنگھ سے ہو چکی تھی۔ نرائن سنگھ کا شمار گاؤں کے خوشحال بھوکساؤں میں تھا۔ مگر چھوٹی بہن کی شادی کے موقع پر میکے آئی ہوئی شانتی کے دل میں راج سنگھ بس گیا۔ رسم کے مطابق شادی سے کئی روز قبل لڑکے والے غلّہ۔ گھی اور دیگر اشیاء خوردنی لڑکی والوں کو بھیج دیتے ہیں۔ یوں ہی بیل گاڑیوں میں لدے پھندے کئی رشتہ داروں کے ساتھ راج سنگھ بھی چھوٹی بہن کی سسرال سے آیا تھا۔ شادی میں ابھی کئی دن باقی تھے کہ شانتی اور راج سنگھ کے لاپتہ ہو جانے کی خبر صبح کے اجالے کے ساتھ سارے گاؤں میں پھیل گئی۔

بھوکسا قانون کے مطابق راج سنگھ شانتی کو لیکر اپنے گاؤں نہیں جا سکتا تھا نہ ہی شانتی کی سسرال اور میکے کے گاؤں میں۔ اس لیے وہ ایک الگ تیسرے گاؤں میں جا بسا۔ جہاں گاؤں کے مکھیا کے ذریعہ شانتی کے شوہر نرائن سنگھ کو شادی کا خرچ ادا کر کے اور برادری کو بھات دے کر شانتی نے بھوکسا بیوی کی قانونی اور سماجی حیثیت پالی تھی۔ ایسی شادیوں کو بھوکسا بڑی وسیع النظری سے محض عین انسانی فطرت سمجھتے ہیں۔

شانتی اور راج سنگھ کو ساتھ رہتے کئی مہینے گزر چکے تھے۔ اس درمیان راج سنگھ اپنے والدین کے پاس سے اپنی بندوق لے آیا تھا شکار تسکین اور شوق کے ساتھ اس علاقے کے باشندوں کی بڑی ضرورت بھی پوری کرتا ہے۔ ٹولیوں میں اکٹھا ہو کر جانے والے شکاریوں کے ساتھ اکثر راج سنگھ بھی جاتا۔ شکار کے ارادہ سے جنگلوں کا رخ کرنے سے پہلے "بھجّا شکاری" کی پوجا ضرور کی جاتی۔

"بھجّا شکاری" تالاب میں نہاتی ہوئی اس جل پری کا بیٹا تھا جس کا تالاب کے کنارے رکھا لباس جنگل سے گھر لوٹتے ہوئے آباؤ اجداد میں سے کسی ایک بھوکسا بزرگ نے اٹھا لیا تھا اور اپنے گھر میں لا کر چھپا دیا تھا۔ لباس کے بغیر وہ جل پری اپنے دیس واپس نہیں جا سکتی تھی۔ اس لیے لباس کی تلاش میں آئی پری لباس واپس نہ ملنے کی صورت میں مجبوراً اس بھوکسا کی بیوی بن کر رہنے لگی تھی۔ کچھ عرصہ بعد پری

کے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام "بھجّا" رکھا گیا۔ "بھجّا" بڑا ہو کر ماہر شکاری اور بڑا اچھا نشانے باز بنا اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے "بھجّا" کی پری ماں نے ایک جادوئی بندوق اپنے بیٹے کو دی۔ اس بندوق سے وہ ایک فائر میں کئی شکار کرتا۔ اس خوبی کی وجہ سے وہ اپنے قبیلے میں "بھجّا" شکاری کے نام سے جانا جانے لگا جہاں یہ خوبی تھی وہاں وہ اپنی بری عادتوں، ظالمانہ حرکتوں کی وجہ سے پورے قبیلے کے لیے دردِ سر بن گیا تھا۔ اسی دَرمیان "بھجّا شکاری کی شادی کے موقع پر پورے قبیلے نے اس کی پری ماں کا ناچ دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ پری نے سب کو بتایا کہ وہ تو صرف اپنا لباس پہن کر ہی ناچ سکتی ہے۔ بڑے جوش سے اٹھ کر بھجّا کے باپ نے پری کا چھپایا ہوا لباس نکال کر پری کو دیدیا۔ جسے پہن کر پری نے ناچنا شروع کیا اور ناچتے ناچتے وہ اڑ کر اپنے دیس پرستان چلی گئی۔

اب بھجّا شکاری نے قبیلے کے لوگوں کو اور بُری طرح ستانا شروع کیا تنگ آ کر ایک دن بھجّا شکاری کو قبیلے کے لوگوں نے جان سے مار ڈالا اور اس کی بندوق کے ساتھ اس کو دفنا دیا گیا۔ لیکن مر کر بھی اس نے اپنے قبیلے کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وقتاً فوقتاً سب کو تنگ کرتا رہتا۔ یوں وہ بھوکسا قبیلے کے لیے مستقل طور پر عذاب کا دیوتا بن کر رہ گیا تھا۔ بھوکسا شکاری اس دیوتا کے عذاب سے بہت ڈرتے ہیں۔ شکار کے ارادے سے جنگل کی طرف جانے سے پہلے بھجّا شکاری

کی پوجا کرنا ہر بھوکسا کے لیے لازم ہے۔

ہمیشہ کی طرح اس دن بھی بھجا شکاری کی پوجا ہوئی مگر اس میں راج سنگھ شامل نہیں ہوا وہ صبح سے پڑا سوتا رہا تھا۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ جھونپڑے کے چاروں طرف جیتی جاگتی زندگی روزمرہ کے معمول میں مصروف تھی۔ شانتی راج سنگھ کو کئی بار جگا چکی تھی۔ مگر راج سنگھ پر کوئی اثر نہیں ہوا، وہ سر سے پیر تک چادر لپیٹے پڑا رہا۔ لیکن اس بار جگانے کے ساتھ ہی شانتی نے راج سنگھ کے ساتھیوں کے شکار پر چلے جانے کی اطلاع بھی دی تھی۔ چادر پھینک کر راج سنگھ بڑی تیزی سے اٹھ گیا جھونپڑی میں رکھی بندوق اور بارود کی تھیلی لے کر وہ جنگل کی طرف چل دیا تبھی شانتی نے پکار کر پوجا کی یاد بھی دلائی تھی مگر اپنے ساتھیوں سے بچھڑ جانے کے خوف سے وہ سُنی ان سُنی کر گیا تھا۔

اب گاؤں میں قدرے سناٹا ہو گیا تھا۔ بوڑھی عورتیں جنگل سے لکڑیاں۔ مچھلی اور کیکڑے اکٹھے کرنے جا چکی تھیں۔ کھیتوں پر کام کرنے کے لیے کچھ عورتیں مردوں کے ساتھ چلی گئی تھیں۔ بچوں نے چرانے کے لیے مویشی کھول لیے تھے اس وقت گاؤں میں کچھ بزرگ بھوکسا، نوعمر لڑکیاں اور بہویں رہ گئی تھیں جو کہ چھوٹے بچوں کو بہلانے اور کھانا پکانے مصروف تھیں شانتی راج سنگھ کے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک سامنے رہنے والی بھابھیوں سے ہنستی بولتی رہی پھر

اندر جھونپڑی میں جاکر کھانا پکانے کی تیاریوں میں مشغول ہوگئی۔

اچانک جھونپڑی کے باہر کئی لوگوں کے تیزی سے بولنے کی آواز سن کر شانتی باہر نکل آئی تھی۔ گھبرایا ہوا منگل سنگھ جلدی جلدی کہہ رہا تھا

"بڑی زوروں کا دھماکا ہوا تھا جیسے بارود سے بھری بندوق کی نال پھٹنے سے ہوتا ہے۔ دھواں کم ہو جانے پر ہم سبھی ساتھی اس سمت گئے بہت تلاش کرنے پر بھی کچھ نہیں سمجھ سکے بس ایک پیڑ کی ڈال پر بارود کی بھری تھیلی اور قمیض ملی جسے راج سنگھ پہن کر گیا تھا۔ وہاں سبھی ساتھی راج سنگھ کو تلاش کر چکے ہیں مگر ابھی تک وہ کہیں بھی نظر نہیں آیا ہے۔"

روکنے کے باوجود شانتی حادثہ کے مقام کی طرف تیز قدموں سے چل دی تھی۔ اس کے پیچھے گاؤں کے اور لوگ تھے۔ عجیب سی خاموشی وسناٹا تھا بارود کی تھیلی اور قمیض راج سنگھ کی تھی۔ لیکن خود راج سنگھ کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اسکی تلاش میں سارا جنگل چھان ڈالا گیا مگر کچھ پتہ نہیں چلا۔

شانتی پھٹی پھٹی آنکھوں سے راج سنگھ کی قمیض اور بارود کی تھیلی کو تکے جا رہی تھی۔ نہ تو وہ روئی اور نہ ہی چلائی اور نہ ہی بے ہوش ہوئی۔ اسے عجب سکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے گاؤں واپس لایا گیا۔

کئی دن گزر جانے پر بھی نہ تو راج سنگھ واپس آیا اور نہ ہی شانتی کی حالت

سنبھلی۔ بس اتنا تغیّر ہوا کہ تھوڑی دیر میں شانتی زوروں سے چیخ اٹھتی اس کی بھوک پیاس اور نیند غائب تھی۔ موجودہ کیفیت کو دیکھتے ہوئے سارا گاؤں اس کے لیے فکرمند تھا۔

گاؤں کے پردھان نے شانتی کے باپ اور پہلے شوہر کو خبر بھجوائی۔ بھوکسا قانون کے مطابق اب اس کا سابق شوہر ہی اس کا پاسبان تھا ساتھ ہی پاس کے گاؤں سے شانتی کے علاج کے لیے بھوکسا ڈاکٹر بھی بلایا گیا جسے قبائیلی "سیانے" کہتے ہیں۔ لیکن "سیانے" نے آکر صاف صاف بتادیا کہ علاج کی قطعاً ضرورت نہیں ہے بلکہ معاملہ کچھ اور ہے اس لیے "بھرّا" کو بلایا گیا۔ بھرّا قبیلے میں جھاڑ پھونک، بھوت پریت اتارنے اور بدروحوں کو بھگانے کا ہنر جانتے ہیں۔

"بھرّا" نے عمل کے ذریعہ جب شانتی کے آسیب زدہ ہونے کا یقین کرلیا تو اس سلسلے میں حالات دیکھتے ہوئے اس نے سب سے پہلے "بھجّا" شکاری یعنی شکار کے دیوتا کی پوجا کرنے کا اعلان کیا۔

پیپل کے گھنے پیڑ کے نیچے بنائے گئے دیوتا کے استھان پر گئی چراغ روشن کے لوبان اور اگربتیاں جلا کر اس نے منتر دہرانے شروع کیے ایک بار پھر وہ دیوتا رُ ... ظت کے لیے دعاگو تھا۔

دپ کافی تیز ... پڑی تھی۔ بھرّا کی صندل اور گیروکی پیشانی پر پسینہ کے

قطرے پھوٹ پڑے تھے۔ منتر کی آواز بہت دور تک گونج رہی تھی۔ ظالم جابر اور عذاب کے اس دیوتا سے قصور معاف کرانا آسان نہیں تھا۔ پورا گاؤں ہی ڈرا سہما تھا۔

شانتی کے باپ اور سابق شوہر آچکے تھے لیکن نہ تو وہ باپ سے مخاطب ہوئی اور نہ ہی شوہر کو پہچان سکی۔ گویا "بھرّا" ابھی تک اپنے عمل میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ شانتی نے پھر ایک چیلنج ماری اور اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ مگر اسے پکڑ کر زبردستی روک لیا گیا۔

"بھجّا شکاری" کو پھول اور بتاشے چڑھائے جا چکے۔ بھرّا منتر ختم کر کے شانتی کی طرف بڑھا اب وہ اس پر تشدّد کر رہا تھا۔ بھرّا کے بھرپور کسی طمانچے شانتی کے گالوں پر پڑے تو تکلیف کے احساس کے بجائے شانتی کا چہرہ اور تن گیا ساتھ ہی شانتی حقارت سے بھری بڑی بھیانک ہنسی سے ہنس پڑی جسے سن کر عورتیں اور بچے تو کیا گاؤں کے مچھو کسانو جوانوں کے اندر بھی خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔ بڑی متانت اور سنجیدگی سے بھرّا نے زبانی طور سے سوال کر کے جاننا چاہا کہ "بھجّا" شکاری آخر چاہتے کیا ہیں؟

جواب میں شانتی نے بڑی کراری آواز اور سخت لہجے میں کسی جاندار کی قربانی طلب کی۔ اب بھرّا کو راہِ نجات مل گئی تھی۔ اس نے پھر سے لوبان اور

اگر بتیاں جلائیں۔ نئے چراغ روشن کیے اور پھول بتاشوں کے ساتھ ہی ایک مرغ کی قربانی دی۔ ساتھ ہی بلند آواز میں منتر پڑھنے لگا سب کی نگاہیں شانتی پر مرکوز تھیں۔ اس کے چہرہ کا تناؤ اب کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بازو بھی اس نے ڈھیلے چھوڑ دیئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک ٹوٹی ٹہنی کی طرح زمین پر گر گئی۔ "بھرّا" کا چہرہ چمک اٹھا۔ یقیناً اب اسے کامیابی حاصل ہو چکی تھی۔ پھر پر اعتماد اور اونچی آواز میں "بھرّا" نے اپنا منتر دہرایا۔

خورد موضع کی ہستی مکّے مدینے کی بستی

خدا کی خدائی مان کر محمّد کی بادشاہی کو مان کر

فاطمہ بی بی کو مان کر دُلدُل گھوڑے کو مان کر

مہر تیری جشن تیرا چلے چلے کون نہ چلے

دریا بائیس خواجہ چلے منتروں سے پربھاشا چلے

میرے گرو کا دچن سانچا

دیکھے دنیا تماشہ تیرا

اور "بھرّا" کے الفاظ ختم ہونے کے ساتھ ہی سچ مچ پورے گاؤں کے بھوکساؤں نے دیکھا ایک ہولہ، ایک سایا یا دھوئیں کا مرغولہ سا شانتی کے اوپر سے اٹھ کر فضا میں غائب ہو گیا۔

شانتی نے آنکھیں کھولیں اس میں اٹھ کر بیٹھنے کی بھی سکت نہ تھی۔ بھرّا نے شانتی کا ستا ہوا چہرہ بغور دیکھا "بھجّا شکاری" کا آسیب شانتی پر سے اتر چکا تھا فضا خاموش تھی پورا گاؤں چپ تھا شانتی کا باپ اور سابق شوہر نرائن سنگھ اس کے قریب آئے شانتی باپ کی گود میں سر ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ خود اس کے باپ کی آنکھیں پرنم تھیں۔ نرائن سنگھ اسے تسلی دینے لگا اور ٹھیک ہو جانے پر اسے واپس اپنے گھر چلنے کو کہہ رہا تھا تبھی سامنے سے راج سنگھ آتا ہوا دکھائی دیا اس کے ہاتھ میں بندوق کے ساتھ بارود سے بھری ہوئی وہی تھیلی تھی اور اس نے وہی قمیض پہن رکھی تھی جسے جنگل کے ایک پیڑ پر رکھی ہوئی تقریباً سارا گاؤں دیکھ چکا تھا شانتی کے آنسو رک گئے اس کے ساتھ سارا گاؤں حیران اور ششدر راج سنگھ کو تک رہا تھا۔

اچانک بہت سے لوگ بولنے لگے بہت سے سوال پوچھے جانے لگے لیکن راج سنگھ خود بڑا حیران تھا اس نے ہر سوال پر حیرت کا اظہار کیا بڑے تعجّب سے اس نے کہا۔

"پتہ نہیں کیوں ایسے سوال پوچھے جا رہے ہیں وہ غائب ہی کب ہوا تھا۔ وہ تو صبح کو شکار کے لیے گیا تھا اور دن ڈھلنے سے پہلے ہی واپس آ گیا۔ شکار کے دیوتا کی پوجا کر کے نہیں گیا تھا اس لیے کوئی شکار اسے نہیں مل سکا۔ شکار کی تلاش

کے ساتھ ہی اس نے گاؤں کے اپنے ساتھیوں کو بھی جنگل میں ڈھونڈھا تھا گر اسے
کوئی بھی۔ ملا۔ شکار کی جستجو میں اتنا تھک گیا کہ وہ اسی جنگل میں سو گیا آنکھ کھلتے ہی
اپنی قمیض پہن کر اور بارود کی تھیلی اور بندوق لیکر سیدھا گھر کی طرف چلا آرہا ہے۔
راج سنگھ کی بات سن کر بھجّا مسکرا اٹھا۔ مگر سارا گاؤں "بھجّا" شکاری کے خوف سے
ایک بار پھر لرز اٹھا۔

راج سنگھ شانتی کے قریب آیا تو شانتی اسے ہاتھوں سے اس طرح چھوڑ رہی
تھی دیا اسے اپنی آنکھوں کی بیشانی پر اعتبار نہ ہو۔ شانتی کے باپ اور پہلے شوہر کی
اب وہاں کوئی ضرورت نہ تھی اس لیے وہ خاموشی سے اٹھ کر واپس لوٹ گئے۔

ترائی کے جنگلوں میں آباد قبائیلی دنیا کے اس بھوکسا گاؤں میں زندگی پھر
سے پیدا ہو چکی تھی۔ گویا غروب ہوتے ہوئے سورج کے ساتھ ہی ہر بھوکسا دل
میں وقتی طور سے بھجّا شکاری کی ہیبت بھی کم ہو گئی تھی۔

سمجھوتا

کھلے آنگن نما میدان کے مٹی اور گوبر سے لیپے ہوئے کچے صاف فرش پر جاڑوں کی سنہری دھوپ بکھری تھی جہاں سارے گاؤں والے جمع ہو گئے تھے۔ نزدیک و دور سے بلائے گئے معمّر بھوکسا سامنے والی دری بچھی چارپائیوں پر بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ جن کے سامنے گوپال سنگھ بھوکسا اونچی دھوتی۔ آدھی باہنوں کا شلوکا، سر پر ٹوپی اور کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں پہنے کھڑا تھا۔ اپنا مسئلہ وہ تخت کے سامنے رکھ چکا تھا۔ بھوکسا زندگی کے معمول میں نئی بات نہیں تھی۔ عام سا واقعہ تھا گوپال سنگھ کی بیوی نرملا کو رام سنگھ بھگا لے گیا تھا۔ تخت کے ذریعہ گوپال سنگھ کا رام سنگھ سے اپنی بیوی نرملا کی واپسی کا مطالبہ تھا۔ رام سنگھ گوپال سنگھ کے بچپن کا ساتھی تھا اور یہ واقعہ سارے گاؤں کے علم میں تھا۔

نینی تال کی اونچی نیچی، سرمئی پہاڑیوں کے اوپر نینی دیوی بستی ہیں تو ان کے قدموں کی ترائی میں بھوکسا قبیلہ۔ گاؤں کے اطراف میں میلوں تک پھیلے کھیت اور جنگل کے مالک وسیع القلب بھوکسا فطرتاً خاموش اور سیدھے ہوتے ہیں۔ زمینوں پر سخت محنت کر کے ضرورت سے زیادہ غلّہ اگاتے ہیں۔ یہی غلّہ

زندگی کی تمام تر ان کی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ شہروں کے تاجر اس علاقے کو غلّے کے عوض ہر چیز بہم پہونچاتے ہیں۔ روپے کا مصرف محض زیورات کی صورت میں نظر آتا ہے مختلف دَور کے رائج سکّوں پر کُنڈے لگوا کر رنگین کلابتّو میں گندھے لاتعداد زیورات بھوکسا عورت کی ملکیت ہوتے ہیں۔

نئی تہذیب وتمدّن سے دور ترائی کے جنگل اور گھاٹی میں رہنے والے اس قبیلے کی آج بھی اپنی الگ دنیا ہے جس کی معاشرت، تمدّن اور رسم ورواج زندگی کی تیز گامی اور بدلتے وقت سے متاثر نہیں ہوئے ہیں آپسی جھگڑے اور دیگر مسائل اگر گاؤں کے پردھان کے ذریعے طے نہیں ہو پاتے تو تخت کو رجوع کیا جاتا ہے یہ تخت عدالت کا چھوٹا سا نمونہ ہوتے ہیں۔

لوکی، ترو ئی اور کدّو کی ہری بھری بیلوں سے ڈھکی جھونپڑیوں پر زرد اور سفید پھول دور سے ہی چمک رہے تھے۔ سامنے کی دیواروں کی سجاوٹ مختلف پھولوں، جانوروں اور پرندوں کی تصویریں بنا کر کی گئی تھی پھونس اور بانس پر مٹی کی تہہ چڑھا کر کھڑی کی گئی۔ ملی جلی جھونپڑیوں کا سلسلہ ایک قطار میں تھا۔ جس نے کھلے میدان کو تین طرف سے گھیر رکھا تھا چوتھی طرف پوری آبادی کے پالتو جانوروں کے لیے مشترکہ مویشی خانہ تھا۔ باقی حصّہ گاؤں سے باہر جانے کا راستہ۔

جھونپڑیوں کے درمیان قدرے بڑا جھونپڑا گاؤں کے پردھان کا

تھا جس کے سامنے پیپل کے بڑے پیڑ کے نیچے چبوترا بنا کر دیوتا کا استھان بنایا گیا تھا۔ جہاں پر اس وقت سب لوگ اکٹھا تھے۔ سامنے کھڑے گوپال سنگھ نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔

تخت کے سربراہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی رنگین کپڑوں کے جھرمٹ سے ایک رنگ الگ ہو کر رام سنگھ پر لگائے گئے الزام کی تردید کرنے لگا۔ یہ نرملا تھی۔ جو بڑے پُروقار انداز میں بول رہی تھی۔ رام سنگھ اسے بھگا کر نہیں لے گیا تھا بلکہ وہ خود اپنی خوشی سے اس کے ساتھ گئی تھی اور ایسا کرنے کی وجہ گوپال سنگھ کی وہ نااہلی تھی جس کا رونا روزِ اوّل سے ہی مرد کی دست نگر عورت نے مرد کے خلاف رویا تھا۔ وہی کھانا کپڑا نہ ملنے کی شکایت اور روزمرّہ کی زندگی کی سختیاں اور گوپال سنگھ کی بد مزاجی کا مفصّل بیان تھا نرملا کی زبان رواں تھی جبکہ گوپال سنگھ کی پُرشوق نگاہیں اس مجسّم حسن پر ٹکی ہوئی تھیں کان تو گویا کچھ سُن ہی نہیں رہے تھے۔

نرملا کی رنگت پہلے سے نکھر آئی تھی۔ کالی گوٹ لگے سُرخ چھینٹ کے گھیر دار لہنگے اور رنگ برنگے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی گئی کرتی پر گول بھرا بھرا سا چہرہ نیلی اوڑھنی جو سر پر بندھے اونچے جوڑے کے ساتھ آدھی پیشانی کو ڈھکتی ہوئی پیچھے کمر کے نیچے تک پھیلی ہوئی تھی۔ گلے میں بڑے سکّوں کے زیورات، دونوں کلائیوں میں کانچ کی چوڑیوں کے ساتھ گلٹ کے کنگنوں سے سجی نرملا کی خوبصورت

شبیہہ میں گوپال سنگھ کھو سا گیا تھا۔ گوپال سنگھ کی بے خودی سے بے نیاز نرملا تخت
کے سامنے رام سنگھ کو بے قصور ثابت کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ اس کا
ایک ایک لفظ اور گوپال سنگھ کا یوں والہانہ انداز میں ایک ٹک نرملا کو تکے جانا
رام سنگھ کے اندر عجیب سا فاتحانہ جذبہ پیدا کر رہا تھا جس کی غمازی ہونٹوں پر پھیلی
ہوئی اس کی مسکراہٹ کر رہی تھی۔

تخت پوری کیفیت سمجھ چکا تھا۔ نرملا گوپال سنگھ کے پاس جانا نہیں چاہتی
بھوکسا عورت کسی بھی وقت اپنے شوہر کو چھوڑ سکتی ہے اپنی زندگی کو خوشگوار طور
پر گزارنے کا پورا حق اسے حاصل ہے اور ایسے فیصلے سے اس کی سماجی حیثیت
ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس صورت میں اگر رام سنگھ نرملا کو بحیثیت بیوی کے
رکھنا چاہتا ہے تو حسبِ دستور اس خرچ کی ادائیگی کر دے جو گوپال سنگھ نے نرملا
سے شادی کرنے پر کیا تھا۔ تخت کے فیصلے پر رام سنگھ خرچ کی ادائیگی کے لیے
رضامند تھا۔

خوابوں کی دنیا سے لوٹ آیا تھا گوپال سنگھ بجھے انداز میں خرچ کی رقم
بتادی جسے کامیابی کے نشے میں سرشار رام سنگھ نے سب کی موجودگی میں بڑی شان
سے ادا کر دیا۔

کانپتے ہاتھوں میں کاغذ کے نوٹ پکڑے ہوئے گوپال سنگھ پھٹی پھٹی

آنکھوں سے نرملا اور رام سنگھ کو مسکراتے دیکھ رہا تھا۔ اچانک کھانسی کے تیز جھٹکوں سے اٹکتی ہوئی کانپتی آواز میں ایک کمزور عورت نے روتے ہوئے تخت کے روبرو اپنے کو پیش کیا۔ یہ رام سنگھ کی بیوی تھی۔

گھیردار لہنگے کرتی اور اوڑھنی میں ڈھکی کھڑی وہ تھر تھر کانپ رہی تھی کمزور آواز میں رو رو کر اس کی سنائی داستان کو سب نے سُنی۔

رام سنگھ پسینے میں نہا گیا۔ نرملا سے اس نے اپنی پہلی بیوی کے طویل علالت کے بعد مرجانے کا ذکر کیا تھا۔ مگر آج تخت اور بھرے گاؤں کے سامنے وہ زندہ موجود تھی تنہا بھی نہیں آئی تھی رام سنگھ کے دو چار رشتہ داروں کو لیکر آئی تھی حقیقت کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ایسے میں خوشیوں سے بھرا دل ڈوبتا سا محسوس ہو رہا تھا۔ کہیں نرملا اپنا ارادہ نہ بدل دے۔

رام سنگھ کی بیوی کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کا سوال سیدھے تخت سے تھا مہینوں سے بیمار عورت کا اب کیا ہوگا؟ جبکہ نرملا رام سنگھ کی بیوی ہو گئی ہے رام سنگھ کے علاوہ دوسرا کوئی بھی سہارا اس دنیا میں نہیں ہے تخت کے سامنے واقعی اب ایک مسئلہ تھا۔

نرملا کی واپسی کی امید کی ہلکی سی کرن گوپال سنگھ کی نگاہوں میں چمکی۔ رام سنگھ نے بتایا اس کی بیوی کا مرض لاعلاج ہے وہ کسی بھی کام کی نہیں ہے

بہت پہلے ہی وہ اسے چھوڑ چکا ہے بلکہ اپنے گھر سے نکال چکا تھا اور اب اسے نہیں رکھے گا۔

"یہ تو ناممکن ہے پہلی بیوی کا حق اسے ملنا چاہیے رام سنگھ۔ اور خاص طور پر اس لیے جبکہ اس کا تمھارے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے" پلنگ پر بیٹھے ہوئے بزرگ بھوکساؤں کا مشترکہ فیصلہ تھا۔

گھبرایا ہوا رام سنگھ کبھی نرملا کو دیکھتا کبھی تخت کو غصہ تھا مگر بیمار بیوی پر اس کا بس نہیں چل رہا تھا جو برابر رو رو کر فریاد کر رہی تھی۔

ان بدلتے حالات میں گوپال سنگھ کو اپنے خوابوں کی واپسی کا یقین ہو چلا تھا کہ حیران کھڑی نرملا سے اس کی نگاہیں چار ہوئیں۔ نفرت سے ہونٹ سکوڑ لیے نرملا نے۔

حقّہ کا لمبا کش لیکر تخت کا سربراہ رام سنگھ کو سمجھا رہا تھا۔ "بھوکساؤں میں دو کیا کئی کئی بیویاں ایک ہی گھر میں رہتی ہیں۔ رام سنگھ تم اس اپنی بیوی کو بھی رکھو۔"

رام سنگھ اپنی معذوری کا ہر ممکن پہلو اس وقت تخت کے سامنے رکھ رہا تھا۔ تبھی نرملا نے رام سنگھ کی روتی فریاد کرتی بیوی کو گلے سے لگا لیا۔

"ہم دونوں ایک ہی گھر میں رہیں گے" نرملا کی آواز نے کھلے میدان میں

بیٹھے سبھی لوگوں کو متوجّہ کر لیا۔ رام سنگھ اور اس کی بیوی دونوں ہی نرملا کو یوں دیکھ رہے تھے گویا کانوں پر یقین نہ ہو۔

گوپال سنگھ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتا تخت اور برادری کے سامنے آکھڑا ہوا اس کا چہرہ دھلے کپڑے کی طرح سفید تھا۔ مٹھی میں دبے ہوئے روپے اس نے تخت کے سامنے رکھ دیئے سب کی نگاہوں میں ایک ہی سوال تھا گوپال سنگھ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

"رام سنگھ میرے بچپن کا دوست ہے۔ اس نے ادائیگی کی رقم کھیت رہن رکھ کر حاصل کی ہو اور اب اس پر دو بیویوں کا خرچ ہے ایسے میں نرملا وہاں بھی خوش نہیں رہ سکے گی اس لیے یہ رقم میں اسے واپس لوٹا رہا ہوں۔"

خاموش مگر مطمئن انداز میں گوپال سنگھ نے روپے رام سنگھ کو دیدیئے جس کے چہرے پر سب کچھ پا کر بھی ایک عجیب سی شکست خوردگی تھی۔

چوتھا شوہر

گیارہ افراد پر مشتمل ہماری سروے کمیٹی نے اس مرتبہ اپنی تحقیق اور ریسرچ کے لیے جولنسار باور کے قبائیلی علاقے کا انتخاب کیا تھا اس علاقے کے بارے میں کافی رومانی اور رنگین قصّے اور داستانیں ہم نے سُن رکھی تھیں اس کی اصلیت جاننے اور سمجھنے کا ہمیں بڑا اشتیاق تھا بصد عجلت اپنی تیاریاں مکمّل کر کے ہم سب اپنے ذہنوں میں تجسّس لیے چل پڑے تھے اس سفر سے سب ہی خوش تھے۔ میدانوں کی تپش اور لو دھوپ سے دور تین ہفتے جولنسار کی پہاڑی قبائیلی بستیوں میں گزارنے کا خیال بڑا کیف آگیں اور فرحت بخش تھا۔

اس ریسرچ ٹیم کی سربراہی کی ذمّہ داری مجھے سونپی گئی تھی اور اس سلسلے میں میری معاون تھیں ارملا سکسینہ اور نور ریسرچ اسکالرز جنھیں تین ٹکڑیوں میں بانٹ کر پہلے سے طے شدہ سطروں پر جولنساری قبیلے اور ان کی زندگی کے بارے میں پوری معلومات فراہم کرنی تھیں۔

پہاڑوں کے درمیان سے بہتی جمنا ندی کے ایک طرف ٹہری گڑھوال اور اتر کاشی ہے دوسری طرف جولنسار باور کا خوبصورت علاقہ حدِ نگاہ تک برف پوش

پہاڑیوں کے درمیان سے نکلی سڑک سے کا کسی دہرہ دون اور لکھواڑ پُل کو پار کرتے ہوئے ہم جولنسار باور کے علاقے میں جا پہونچے۔ حسین دل کش قدرتی نظاروں کو دیکھتے سحر زدہ سے کھڑے ہم سب سوچ رہے تھے کہ جیسا سنا تھا اس سے بھی بڑھ کر خوبصورت علاقہ ہے جسے قدرت نے بڑی فیاضی سے لازوال حسن بخشا ہے۔

چھوٹی بڑی اونچی نیچی اور کھڑی پہاڑیوں کے درمیان سیڑھی دار سرسبز کھیتوں کے آس پاس پتھر اور لکڑی کے بنے دو منزلہ مکانوں میں آباد جولنساری قبائلی بستیوں کو ہم دور سے کھڑے کھڑے گھنٹوں دیکھا کیے۔ علاقے کی طرح یہاں کے قبائلی باشندے بھی خوبصورتی میں بے مثال دکھائی دیتے تھے۔ خصوصاً جولنساری خواتین۔ ان کی محنت کش سخت زندگی بھی کھلی آنکھوں سے ہم سارا دن دیکھتے رہے سر پہ بھوسے یا گھاس کے بڑے بڑے بوجھ اٹھائے۔ پیڑوں پر چڑھی لکڑی کاٹتی ہوئی۔ مویشی چراتی ہوئی پانی کے بھرے گگروں سے لدی ہوئی کھیتوں اور کھلیانوں میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی جولنساری خواتین کا روزمرّہ کا یہ معمول بھی ہمیں خاصا مرغوب کر رہا تھا۔

مشعلوں کی روشنی میں کھلے آسمان کے نیچے ٹھوس پہاڑیوں پر ڈھول اور نگاڑوں کے ساتھ روایتی لباس پہن کر ناچتے گاتے جولنساریوں کو ہم نے

لوک نرت میں یکتا اور بے جوڑ پایا۔ غیر شادی شدہ اور نوعمر لڑکے اور لڑکیوں کو اور میکے آئی شادی شدہ لڑکیوں کو جولنساری سماج کی دی ہوئی کھلی جنسی آزادی اور اور ان کے آنگن کی رونق دیکھ کر ہم سب اپنے مہذب سماج کی تنگ نظری پر دل ہی دل میں کڑھتے رہے تھے گھر کے اندر اور باہر ہر رنگ و روپ میں ہمیں جولنساری عورتوں اور مردوں کے درمیان کوئی امتیاز اور کوئی فرق نظر ہی نہیں آرہا تھا۔

اپنے قیام کے پہلے ہی دن ہمیں جولنساری قبیلوں کے متعلق سنی سنائی باتوں کے کافی حد تک صحیح ہونے کا اندازہ ہوگیا تھا۔ جولنساری بڑے مہمان نواز ثابت ہوئے۔ جولنساری خواتین کو قیام و طعام کے سارے کام انجام دیتے دیکھ کر ہمیں اپنی سروے کمیٹی کے ڈائرکٹر کی کہی بات یاد آگئی" جولنساری میزبان مہمانوں کی تواضع اور آرام کی خاطر اپنے گھر کی عورتیں پیش کردیتے ہیں۔" اس سے بچ کر رہنے اور پوری احتیاط رکھنے کی آگاہی و تنبیہہ بھی ریسرچ اسکالرز کو انھوں نے پہلے ہی کردی تھی۔ اسی لیے سبھی لڑکے پتھریلی زمین پر پوال اور گدے بچھا کر اسی بڑے سائبان میں سونے آگئے تھے جہاں میں سونے لیٹی تھی اور سب نے طے کرلیا تھا کہ دن بھر مختلف سمتوں میں الگ الگ کام کریں گے مگر رات کو وہیں قیام کریں گے جہاں اپنی معاون اوملا کے ساتھ میں رہوں گی ان کے

اس فیصلے سے مجھے کافی اطمینان تھا۔

ہر رات کے کھانے کے بعد جب ہم سب کسی نہ کسی سائبان کے نیچے بستر وں میں بیٹھے ہوتے تو دن بھر میں جولنساری قبیلوں سے متعلق فراہم کی ہوئی تفتیش اور پرلطف معلومات ایک دوسرے کو سناتے ہوئے ساتھ ہی دوسرے طور سے بھی اپنے اپنے تاثرات بیان کرتے جاتے۔ ارملا کو وہاں کی خواتین کے زیورات اور لباس بہت پسند آئے تھے وہ ان کا ذکر ضرور کرتی۔ سردار بھگونت کو یہاں کاشتکاری کے طریقے قدیمی اور گزشتہ بھارت کے ابتدائی دنوں کی یاد دلاتے۔ ہل سے لیکر غلہ رکھنے کے ان کے سارے انتظام کے بارے میں وہ اپنی واقفیت جتاتے ہوئے وہ روز باتیں کرتے ارشاد کو جولنساریوں کی تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی وہ ان کے بتائے ایک ایک پوائنٹ کا تسلسل ہندوستانی راجاؤں کے دور سے ملانے میں کوشاں رہتا اور سب کو یقین دلاتا کہ اس میں سچائی کافی حد تک ہے۔ نریش ان قبائیلیوں کے مکانوں کی بناوٹ اور ان کے رہن سہن کو بغور دیکھ کر اپنے گھروں اور اپنے رہن سہن سے ان کا موازنہ کرتا شری کانت اور پدماکر کو جولنساری نظام و سماج کا انداز الگ انوکھا اور بالکل کمزور لگتا جبکہ جوزف اور ممتاز ان کے برعکس جولنساری سماجی نظام اور قاعدے کی فراخدلی اور وسیع النظری کا ذکر کرتے نہ تھکتے تھے لیکن شنکر کو پسند تھی بے فکری اور رنگینی اور خوشی سے

بھرپور جولنساری زندگی۔ یوں مختلف زاویئے سے ہم سب انھیں قبائیلیوں کا ذکر کرتے ہوتے مگر چندر بھان اپنے آپ میں غلطاں کچھ سوچتے اور مسکراتے چپ بیٹھے رہتے اس نئی دنیا اور نئے ماحول کے تذکروں میں سب ایسا گم جاتے کہ باتونی چندر بھان کی اس نئی خاموشی کی طرف کسی کا خیال بھی نہ جاتا۔

انھیں دنوں میں ہم نے اپنی چھان بین سے ان کے دلچسپ رسم ورواج کے بارے میں کافی معلومات فراہم کر لی تھیں۔ جولنساریوں میں مشترکہ بیوی کا رواج چلا آیا ہے صرف بڑا بھائی بیاہ کر بیوی لاتا ہے مگر وہ بیوی یکساں طور پر اس کے سبھی چھوٹے بھائیوں کی بیوی ہوتی ہے ان کے ایسا کرنے کے سلسلے میں دو باتیں ہمیں معلوم ہوئیں ایک تو آبائی جائیداد کو حصے ٹکڑوں میں بٹنے سے محفوظ رکھنا دوسری بڑی وجہ ہے کہ یہ اپنا سلسلۂ نسب پانڈوؤں سے جوڑتے ہیں۔

"پانڈو دروپدی کو لائے اور ماں کو پکار کر کہا دیکھو ہم کیا لائے ہیں۔"

"جو کچھ لائے ہو پانچوں بانٹ لو" ماں نے دروپدی کو چیز سمجھ کر حکم دیا اور حکم کے مطابق دروپدی پانچوں میں بٹ گئی اور پھر دروپدی کی ساڑھی کی طرح یہ رسم پھیلتی گئی جسے جولنسار باور اپنے آنچل میں آج بھی سمیٹے ہوئے ہے! اسی طرح کی اور باتیں اور مفصل معلومات یکے بعد دیگرے ہمارے علم

میں آئیں اور جولنسار کے لیے ہماری دلچسپی بڑھتی جاتی۔

ایک ہفتہ یوں چپکے سے گزر گیا کہ ہم میں سے کسی کو پتہ بھی نہیں چلا۔ اب ہمارے اندر کچھ ٹھہراؤ آگیا تھا۔ جولنسار کا علاقہ اب انجانا بھی نہیں لگتا تھا۔ دھیرے دھیرے ہم ان کی اصلی زندگی کے قریب بھی آگئے تھے۔ ہمیں صاف طور پر جولنسار قبیلے میں طبقاتی تفرقہ اور امتیاز بھی دکھائی دے گیا تھا در اصل ان کا واحد ذریعۂ معاش خود کاشت ہے زمینوں کا مالک جولنساری راجپوت رہا ہے اور ان کے رحم و کرم کا محتاج ان کی زمینوں کا محنت کش مزدور جولنسا کولٹا ہریجن ہے بہ ظاہر ہنستی گاتی بے فکری خوشی اور رنگینی سے بھرپور جولنسا کی زندگی کے اندر کی کلفتوں کا علم ہمیں ہو چلا تھا۔

ہماری جستجو کھوج اور کرید نے سادہ لوح جولنساریوں سے وہ سب کچھ کھلوایا جو ہم جاننا چاہتے تھے اور سب کچھ جان کر ہمیں بڑی شدید ذہنی کوفت اور صدمہ ہوا تھا خصوصاً غربت اور تنگ دستی پھر پشتینی قرضوں کی ادائیگی کیلئے کولٹا خواتین کا کوڑیوں کے مول بیچا جانا اور پھر انھیں بیچنے والے خود ان کے باپ بھائی بیٹے یا شوہر کو غیرت و شرم تو درکنار کچھ اور حاصل بھی نہیں ہوتا۔ حاصل شدہ رقم پشتینی قرضوں کا محض سود بن کر ساہوکار خاداؤں کی تجوڑی میں جاتی ہے اور کولٹا کی بندھوا مزدور اور زر خرید غلاموں کی سی حیثیت ہمیشہ

برقرار رہ جاتی ہے۔ بڑھاپے میں گھر لوٹ آنے والی ان کولٹا خواتین کے پاس دو ایک معمولی زیور اور تھوڑی سی رقم کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

ہم نے گھروں میں جھانک کر مشترکہ بیوی کو بھی غیر مطمئن بے کیفی اور مصیبت زدہ زندگی کا شکار پایا۔ حالاں کہ خود جولنسارکی خواتین اپنی تہذیبی و اخلاقی پستی سے قطعاً لاعلم اور بے بہرہ ہیں بلکہ بے حس ہیں شراب ناچ رنگ اور عیاشی کی اپنی شغل میں پھنس گئ کر سرمستی و عارضی خوشی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتی ہیں۔ لیکن ہمیں ان سے دلی ہمدردی تھی اور کچھ نہ کچھ کرنے کا جوش بھی تھا ہمارے اندر تھا۔

اب ہماری سوچ کا دوسرا رخ تھا۔ جولنساریوں کی زندگی میں یکسر اصلاح و تبدیلی لانے کے لیے جو جوش و ولولہ تھا اس سے پیدا شدہ ماحول میں نئے نئے خیالات سجھاؤ اور مشورے بڑی رات تک ہم ایک دوسرے کو بتاتے اور سناتے رہتے متفقہ طور پر یہی رائے تھی کہ سروے کمیٹی کی رپورٹ میں ان تمام خامیوں کو ختم کرانے کی پُرزور سفارش کی جائے۔ رات گئے تک ہم سب بڑی دلچسپی سے جولنساریوں اور خصوصاً ان کی خواتین کا مستقبل سنوار دینے کا پلان بنایا کرتے لیکن چندر بھان ہماری باتوں کی طرف ذرا بھی متوجہ نہیں ہوتا گہری سوچ میں بیٹھا سب کی سنتا رہتا اب ہمیں اس کی خاموشی کا احساس ہو چلا

تھا۔ اس کی اس نئی بات و انداز کے کیے سبھی اسے ٹوکتے کچھ پوچھتے اور بولنے پر اکسایا کرتے مگر وہ نپے تلے جواب دے کر پھر بے تعلق بنا ہو کر بیٹھا رہتا اور اپنے خیالوں میں گم ہو جاتا۔ چوں کہ اب وہ پہلے جیسی بات نہیں رہ گئی تھی ہمارے ذہنوں میں جو لنشاریوں کے علاوہ اور باتیں بھی آنے لگی تھیں اس لیے سب کی توجہ چندر بھان کی طرف تھی "اسے ہوا کیا ہے"؟

ہم سب ایک دوسرے سے پوچھتے چندر بھان مضبوط ارادے کا حوصلہ مند خوش دلی نوجوان تھا۔ یہ مجھے معلوم تھا اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ چھوٹی سی عمر میں اس کے والدین کسی حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ اس کی پرورش اور تعلیم کی تمام تر ذمہ داری اس کی دادی نے اپنی حیات تک سنبھالی تھیں اس کے بعد گاؤں کا مکان اور بچی ہوئی تھوڑی سی زمین کو بیچ کر وہ خود اپنا کفیل تھا لیکن ان حالات میں بھی اس میں زندگی کا حوصلہ کم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے خود مجھے بھی اس کے لیے سخت الجھن تھی میں نے اس کے ساتھیوں سے باز پرس بھی کی مگر کچھ معلوم نہ کر سکی۔ اس کے ساتھیوں کو اس کے ساتھ ساتھ لگے رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔

مجھے خیال تھا کہیں چندر بھان کسی ذہنی الجھن یا مرض کا شکار تو نہیں ہو رہا ہے مگر ارملا نے چندر بھان سے متعلق چونکا دینے والی خبر دی۔ اس کی

موجودہ کیفیت کی وجہ دراصل اس کا "کسی جو منساری لڑکی سے چکر ہے" مجھے یقین نہیں آیا لیکن مزید چھان بین اور لڑکوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ سچ ہے اور وہ لڑکی اسی علاقے کی ہے چندر بھان کو یہاں آتے ہی اس لڑکی سے دلچسپی ہو گئی تھی چندر بھان کو اس کے ساتھ کئی گھنٹے تک دیکھا گیا تھا اور اب چار پانچ روز سے وہ گھاس اور لکڑیاں لینے نہیں آرہی ہے۔ چندر بھان سے نہیں مل رہی ہے اور جانتے ہوئے بھی چندر بھان اس کے گھر اور بستی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔

بغیر زیادہ سوچے ہوئے میں نے سیدھے چندر بھان کو بلا کر بات کی وہ اس سلسلہ میں کافی سنجیدہ تھا۔ جیسی مجھے توقع تھی اس نے بے جھجک ہم سب کے سامنے کہا "میں انگوری کے اگر کچھ کام آسکوں تو اچھا ہی ہوگا"؟

"تو کیا۔ ؟ تم اس سے شادی کروگے"؟ بڑی حیرت سے ارملا نے پوچھا تھا۔ "حرج کیا ہے؟" پُر اعتمادی سے چندر بھان نے پوچھا۔

لڑکے کھلکھلا کر بڑی زوروں سے ہنس پڑے مگر وہ پوری سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"آپ بات کرلیں ۔۔ آج ہی بات کیجیے"

اس کا تخاطب مجھ سے تھا۔ اس کی موجودگی میں رہ گیا رہے دیتے لگی۔ مذاق ہی مذاق میں بڑی متانت اور سنجیدگی سے ہم نے لڑکی والوں سے

مل کر بات کرنا طے کر لیا۔ دراصل ہم سبھی اس وقت جولنساری نظام میں سدھار لانے کے موڈ میں تھے اور اس موقع کو کھونا بھی نہیں چاہ رہے تھے دوسرے یہ سچ تھا کہ چندر بھان کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا وہ اپنا ذمہ دار خود تھا اس لئے اس کے فیصلے کے بعد ہماری طرف سے راہ میں کوئی دشواری بھی نہیں تھی۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق ارملا۔ شنکر اور ممتاز کے ساتھ میں اس قبائیلی بستی میں پہونچی۔ شنکر اور ممتاز نے دور ہی سے اشارہ کیا۔ سامنے کھٹولے پر پندرہ سولہ سال کی لڑکی بیٹھی چند مہینے کے ایک چھوٹے سے گول مٹول بچے کو بڑے شوق سے کھلا رہی تھی۔ وہ لڑکی کچھ زیادہ ہی خوبصورت تھی۔ نیلے لہنگے پر کالے مخمل کا لیس لگا کرتا لمبی کالی چوٹی کے اوپر آدھے سر تک بندھے سرخ رومال کے گھیرے میں کھلے ہوئے گلاب کی طرح اس کا چہرہ دیکھتے ہی میں اور ارملا دونوں ہی اندر سے کھل اٹھے تھے۔

بڑی خوش اخلاقی سے وہ مسکرائی اور اپنے کھٹولے کے سامنے ہمارے بیٹھنے کے لیے لکڑی کی ستلی سے بنی ہوئی جوگیاں بچھاتے ہوئے اس نے اپنا نام "انگوری" بتایا۔ گھر میں اس وقت وہ اکیلی تھی۔ گھر کے دیگر افراد کی بابت ہمارے سوال پر اس نے بتایا کہ چار دن پہلے اماں جی کی موت ہو گئی ہے۔ بے ماں کا یہ چھوٹا سا بچہ کسی اور کے پاس ٹھہرتا ہی نہیں ہے۔ اس لئے وہ گھر میں بچہ کو

لیے بیٹھی ہے اس کے بجائے پتا جی جانوروں کے لیے گھاس اور جلانے کی لکڑیاں لینے گئے ہیں ادھر ان کے تینوں لڑکے حسب معمول کھیتوں پر کام کرنے گئے ہیں۔

سب نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا "تو یہ بات تھی جو انگوری پچھلے چار پانچ دنوں سے چندر بھان کو نہیں مل سکی تھی۔ بے چاری اپنے چھوٹے بھائی کو سنبھالنے میں لگی ہے۔"

ماں کی موت کے سلسلے میں ہم نے انگوری سے ہمدردی اور افسوس کا بھرپور اظہار کیا۔ اب ہمارے سامنے سوال تھا کہ ہم اپنا مدعا کس سے عرض کریں۔ دل ہی دل میں ہم سب پہلے ہی ڈر رہے تھے کہ دیکھئے یہاں ہماری بات کس طرح لی جاتی ہے۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہاں ایک ایک کر کے سبھی لڑکے آگئے تھے۔ وہاں کھڑے اور بیٹھے سب کے سب بڑے شوق سے انگوری کی باتیں سن رہے تھے۔ ارملا نے چندر بھان کی طرف اشارہ کر کے انگوری سے پوچھا۔

"انھیں جانتی ہو؟"

"ہاں" وہ ہنس کر بولی۔

"کب سے" ممتاز نے شرارت سے پوچھا۔

"جب سے یہاں آئے ہیں" پوری سادگی سے اس نے کہا۔

"اچھے لگتے ہیں نا"؟ شنکر کی فطری شوخی سے بھرا سوال تھا۔

"بہت اچھے" وہ اسی معصومیت سے پھر بولی۔

اس کی سادگی اور معصومیت سب کو پسند آگئی۔ چھوٹا بچہ رو رہا تھا۔ اندر جاکر وہ ایک کٹوری میں دودھ لے آئی تھی اور چمچے سے بچے کے منھ میں دودھ ڈال رہی تھی۔ دودھ پی کر بچہ سو گیا تھا۔ انگوری ہمارے لیے چائے بنانے اندر چلی گئی ہمیں موقع مل گیا ہم سب جو اب تک بیٹھے سوالیہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے اب زبانی رائے کرکے طے کر چلے تھے کہ اپنے آنے کا مدعا انگوری کو بتا دیا جائے اور کل کا وقت معین کرلیا جائے جب اس کے باپ اور بھائی یہاں اس کے گھر پر موجود ملیں۔

چائے پیتے ہوئے میں نے اپنی بات انگوری سے کہنی شروع کی انگوری تم ہمیں بہت پیاری اور بہت اچھی لگیں سب کو دل سے پسند آئیں۔ یہ اپنا چندر بھائی ہے نا ہم سب اس کے لیے جو کچھ کہنے آئے تھے وہ تو کل کہیں گے جب تمھارے باپ اور بھائی یہاں ہوں گے۔ اچھا یہ بتاؤ کھیتوں پر کام کو گئے تمھارے وہ تینوں بڑے بھیا بھی تمھاری طرح اور تمھارے اس چھوٹے سے پیارے بھیا جیسے خوبصورت ہیں؟

"کیا؟" اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں حیرت سے اور پھیل گئیں اور وہ بولی "یہ۔۔۔ یہ میرا چھوٹا بھائی نہیں ہے اور وہ۔۔۔ وہ تینوں بھی بھائی نہیں وہ

۔ وہ تینوں میرے شوہر ہیں اور یہ؟ پلنگ پر سوئے پڑے بچے کی طرف اشارہ کر کے وہ بولی "یہ تو میرا چوتھا شوہر ہے۔ جسے پال پوس کر بڑا کرنا ہے" اس کے گلابی چہرے پر معصومیت اور سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

ہم سب نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا پھر ایک دوسرے کی طرف اور آخر میں چندر بھان کے گھبرائے بگڑے اور خشونت سے بھرے فق چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں اچانک پوری سردے ٹیم کے قہقہے پہاڑیوں میں گونج گئے۔ چندر بھان چلتا جا رہا تھا اور ہم سب احمقوں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلتے واپس اپنے جائے قیام کی طرف لوٹ رہے تھے۔

ایک کہانی ایک سوال

اونچی نیچی اور کھڑی پہاڑیوں کے پیچھے ڈوبتے سورج کی سرخ شعاعیں کدّو لوکی اور تر دئی کی ہری بھری بیلیوں نے ڈھکی جھونپڑیوں پر چمک رہی تھیں اٹھتے دھوئیں کے مرغولوں کے نیچے ٹمٹماتے چراغوں کی ناکافی روشنی تھی۔ سلسلہ دار جھونپڑیوں کے سامنے پلنگوں پر بیٹھے تھارد باتیں کرتے ہوئے حُقّہ پی رہے تھے۔ مچھلی تیل اور ابلتے چاولوں کی مہک پوری فضا میں پھیلی ہوئی تھی عورتوں اور بچّوں کی ملی جلی آوازیں جیتی جاگتی زندگی کا پتہ دے رہی تھیں۔ ایسے میں پورے ایک سال کے بعد کھیم سنگھ رانا نے اپنے اس گاؤں میں قدم رکھّا تو تقریباً سارا گاؤں اس کے گرد سمٹ آیا تھا۔ کھانا پکانا چھوڑ کر بہوئیں اور بیٹیاں گود میں بچے لیے ہوئے بزرگ عورتیں سبھی اس کے پاس آگئیں مگر ان میں روپا نہیں تھی۔ شام کے دھندلکے میں کھیم سنگھ کی پر شوق نظریں اپنی جھونپڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ جہاں میلی زرد روشنی میں اپنی بیوی روپا کو کھڑے دیکھا۔ اطمینان کی گہری سانس لیکر کھیم سنگھ باتیں کرنے لگا۔

پورے سال میں جو کچھ گزرا تھا۔ فصلوں۔ موسم۔ اور مویشیوں کے بارے

میں گاؤں کا پردھان اس کا "کاکا" بہاری سنگھ رانا سرسری طور سے مختصراً اسے بتا رہا تھا۔ اس درمیان ہوئی شادیوں اور بچوں کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے جب آہستہ سے اس نے کہا

"روپا کو بھی بیٹا ہوا ہے"

تو کھیم سنگھ کے ہاتھوں سے چھوٹ کر حقہ نیچے گر پڑا۔ جدائی کے ان بارہ مہینوں میں بنائے خوابوں کے محل مسمار ہو گئے اور کئی سوال ایک ساتھ کھیم سنگھ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ بہاری سنگھ بھرے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"ہاں تم جیل میں تھے پورے سال بھر۔ مگر روپا تمہارے نام پر آج بھی بیٹھی ہے"۔

دراصل بھاروقبیلے کے سماجی نظریئے بالکل مختلف ہوتے ہیں ازدواجی زندگی میں عورت کو جنسی آزادی کے علاوہ یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ جب چاہے وہ دوسرا شوہر کر سکتی ہے۔ ڈوبتے دل کے ساتھ اداس اور حیران کھیم سنگھ رانا آہستہ قدموں سے چل کر اپنے جھونپڑے تک آیا۔

زمین پر بچھی چٹائی پر روپا بیٹھی تھی اور کونے میں چھت سے لٹکا کر باندھی گئی دھوتی سے بنائے گئے پالنے میں بچہ سویا تھا۔ سزا ہو جانے پر کھیم سنگھ روپا کو اپنے چھوٹے بھائی بھنور سنگھ کی سپردگی میں چھوڑ گیا تھا اس لیے روپا کو سر سے پیر تک

بغور دیکھتے ہوئے اس نے بچہ کی طرف اشارہ کرکے پوچھا
"یہ کیا بھنور سنگھ ۔۔۔۔؟"

جواب میں روپا کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے آنکھوں کے کٹوروں سے موتی جھڑنے لگے۔ سسکیوں کے درمیان نامکمل جملوں میں بمشکل روپا بتا سکی کہ کھیم سنگھ کے جیل جانے کے بعد بوٹا سنگھ کچھ اور سرداروں کے ساتھ آکر جبراً اسے اٹھالے گیا تھا۔ بات صاف ہوگئی تھی۔ تھارو عورت پوری جنسی آزادی حاصل ہوتے ہوئے بھی قبیلے کے باہر کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا پسند نہیں کرتی۔

کھیم سنگھ پسینے میں نہایا سامنے بیٹھا رہا اور روپا کے بہتے آنسوؤں کے سامنے اس کا دل ٹکڑے ہوتا رہا۔ محض اپنی آن اور ناموس بچانے کے لیے صدیوں پہلے ان کے آباواجداد جنگلوں میں آبسے تھے برسوں مصیبت اٹھا کر عام دنیا سے کنارہ کش رہ کر اپنی قدیم روائتیں قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے آئے تھے۔

ترائی کے گھنے جنگلوں میں آباد ہندوستان کے قدیم باشندے یہ تھارو قبائیل اپنے آپ کو راجستھان کے رانا راجپوت حکمرانوں کے خاندان کا بتاتے ہیں۔ آپسی لڑائیاں اور مغلوں سے شکست کے بعد راناؤں نے مجبوراً ہمالیہ کی تلہٹی

کے گھنیرے غیر آباد جنگلوں میں پناہ لی تھی۔

"ریاست اور تخت وتاج واپس لے کر ہی اپنے وطن واپس لوٹیں گے اور اس وقت تک زمین پر سوئیں گے اور سیاہ لباس پہنیں گے" یہ عہد مہارانا پرتاپ کے ساتھ دیگر راجپوت راناؤں نے کیا تھا۔ حکومت کی واپسی کے لیے رانا برابر جنگ کرتے رہے اور مٹتے گئے آخر کو ان کی رانیاں اور راجکماریاں وفادار نوکروں اور معتمد سپاہیوں کے ہمراہ ان جنگلوں کی گوشۂ عافیت میں روپوش بیٹھی اپنے شوہر بیٹوں بھائیوں اور باپ کی راہِ انتظار تکتی رہ گئی تھیں۔

ان کے لیے ضروریاتِ زندگی کاشتکاری۔ شکار اور مویشی پال فراہم کی جاتی تھیں۔ باقی سامان بنجارے تاجر غلّے کے عوض شہروں سے لاکر انھیں بہم پہونچانے لگے۔ حالات سے بے بس رانیوں نے راجکماریوں کی شادیاں انھیں نوکروں کے لڑکوں سے کر دیں مگر اس رعب وزعم کے ساتھ کہ ان کے درمیان رانی اور خادم کا لحاظ قائم رہے چنانچہ آج بھی گھر اور باہر دونوں جگہ ہی تھارو سماج میں عورت رانی سمجھی جاتی ہے چونکہ یہ لوگ وقتی طور سے جنگلوں میں ٹھہر گئے تھے اس ٹھہرنے سے "ٹھارو" اور بعد کو تھارو کہلانے والی نسل کی ابتدا انھیں سے ہوئی تھی۔

"تھارو بستی کے خوشحال گھرانوں میں کھیم سنگھ رانا کا بھی گھر تھا جہاں

چھوٹے بھائی بھنور سنگھ اور دو بڑی بہنوں کے ساتھ دھول میں لوٹتا اس کا بچپن گزرا تھا اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ مویشی چراتے ہوئے مچھلیاں پکڑتے ہوئے یا پھر شکار کی تلاش میں کھیم سنگھ نے اپنے علاقے کا تقریباً سارا جنگل چھان ڈالا تھا۔ مگر جنگلوں کے پار جگمگاتی دنیا ہے جانتے ہوئے بھی کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ صدیوں پہلے مہارانا کا کیا ہوا عہد تھارو بھولے نہیں تھے۔ مرد چونکہ راج گھرانے کے نہ ہونے کی وجہ سے عورتوں کا ہم رتبہ نہیں سمجھا گیا اس لیے زمین پر سونا اور سیاہ لباس پہننا صرف عورتوں تک محدود رہا۔

کھیم سنگھ بھی اپنی دنیا انھیں جنگلوں تک محدود سمجھتا تھا۔ جنگلوں میں روپوش رہ کر اپنی معاشرت تمدن سماج اور تہذیب کے اعتبار سے مہذّب دنیا سے بالکل مختلف نظام زندگی رکھنے والے تھارو بے فکری خوشی اور رنگینی سے بھرپور زندگی گزارتے چلے آئے تھے۔

جنگلوں میں میلوں تک پھیلے زرخیز کھیتوں کے مالک ان گمنام اور کنارہ کش رہنے والے قبائیل کا شاندار ماضی کبھی ہندوستان کی تاریخ تھا۔ تاریخ نے ورق بدلا مغلوں کے بعد فرنگی آئے اور پھر سوراج ملا گویا ہندوستان کی تاریخ میں ایک درخشاں باب کا آغاز ہوا مگر صحرا کی کھلی آزاد فضا میں تنہائی۔ آسودگی اور خاموشی سے زندگی گزارنے والے قناعت پسند تھارو قبائیل ہمیشہ کی طرح

حالات سے باخبر ہو کر بھی بے خبر رہے۔ وقت کی رفتار کا کوئی اثر ان کے نظام پر
ابھی تک نہیں پڑا۔ ان کے اپنے قانون اور نظامِ حکومت قائم تھے جس کا احترام
ہر تھارو پر فرض ہے۔

پاکستان سے آئے شرنارتھیوں کو ترائی کے غیر آباد جنگلوں میں زراعت
کے لیے گورنمنٹ نے زمینیں دیں۔ جنگل بڑی تیزی سے کاٹے جانے لگے۔ ٹریکٹر
اور مشینوں سے جدید طریقوں پر کاشت شروع کر دی گئی۔ تھوڑے عرصے میں
کوٹھیاں بھی کھڑی ہوتی گئیں اور موٹریں بھی دوڑتی نظر آنے لگیں۔ اتنی سرعت
سے علاقے میں ہوئی ترقی دیکھ کر تھارو بھونچکے رہ گئے تھے۔

قبائلی شروع شروع میں حیران و سراسیمہ تو ضرور ہوئے مگر فطرتاً کم گو سیدھے
اور محنت کش تھاروؤں نے آخر کو ان بدلتے حالات سے بڑی خاموشی سے سمجھوتا کر لیا
اپنی زمینوں پر محنت کر کے ہمیشہ کی طرح ضرورت سے زیادہ غلّہ اگاتے رہے۔ وقت
گزرتا رہا اور علاقے میں رنگین پگڑیوں والے سرداروں کی آبادی بڑھتی گئی۔ تھارو
اپنے آپ میں سمٹتے گئے اور ان کے اندر مایوسی اور خوف و ہراس بڑھتا گیا۔

شکار کی غرض سے کھیم سنگھ اور اس کے دوستوں کے ساتھ اب بوٹا سنگھ بھی
جانے لگا تھا۔ بوٹا سنگھ سردار بنتا سنگھ کا بیٹا تھا۔ شکار سے واپس لوٹتے ہوئے
ان سے بارہا اور بصد خلوص و اصرار اپنی شاندار اور اونچی حویلی کے اندر آنے کو

کہا مگر لڑکے اپنی تھارو بستی کی طرف چل دیئے۔

انھیں دنوں کھیم سنگھ کی بہن کی شادی ہوئی آس پاس کے گاؤں کے تمام قبائیل مدعو تھے۔ بوٹا سنگھ نے اپنے باپ سردار بنتا سنگھ کے کہنے پر کھیم سنگھ سے شکایت کی۔

"ہم تمھارے پڑوسی اور یار ہیں مگر تم نے ہمیں اپنی بہن کی شادی پر نہیں بلایا"؟

سادہ لوح کھیم سنگھ نے ندامت کے ساتھ بوٹا سنگھ کی طرف دیکھا مگر چپ رہا۔ ہنستے ہوئے سردار بنتا سنگھ کہہ رہے تھے۔

"کوئی بات نہیں ہم تیرے بیاہ پر خود آجائیں گے"!

سردار کی بات سن کر کھیم سنگھ بس شرما کر رہ گیا۔

مگر اب قبائیلی زندگی کا ٹھہراؤ سکھوں کی تیز گام زندگی کے سامنے کمزور پڑنے لگا تھا۔ پھر بھی تھارو قبائیلی مشترکہ طور پر اپنی اسی پرانی طرز رہائش پر اتنے ہی خوش اور بے فکر تھے۔ دن بھر کی کڑی مشقت کے بعد رات گئے تک ناچ رنگ کی محفلیں جما لیتے شراب کا سرور اور پائیلوں کی رم جھم کے ساتھ میٹھے سروں میں لوک گیت انھیں دنیا کے ہر غم سے دور لے جاتے کبھی سوانگ اور ڈرامے ہوتے۔ لوک کتھائیں اور قصہ گوئی سے وقتی ہی سہی مگر تفریح طبع حاصل کر لیتے

یوں رواں دواں قبائیلی زندگی گزر تو رہی تھی مگر اب پہلے جیسا سکون نہیں رہ گیا تھا۔

ہمیشہ سے زراعت ہی تھاروؤں کا تنہا ذریعۂ معاش رہا ہے۔ ادھر پچھلی کئی فصلوں سے ایسا ہوتا آرہا تھا کبھی کھڑی فصل راتوں رات کٹ جاتی یا مویشی تباہ کردیتے یا آگ لگ جاتی۔ فصل کے تباہ ہوجانے پر بنجارے تاجر اور ساہوکاروں سے قرض لیکر گزر ہوتا۔ اصل معہ سود کے سال بھر میں بڑھ کر دگنا اور تگنا ہوجاتا جس کی ادائیگی میں پورا غلّہ نکل جاتا اور پھر بھی قرض ادا نہیں ہوپاتا۔ قبائیلیوں کے لیے یہ مصیبت بالکل نئی تھی اس سے چھٹکارا پانے کے لیے ان میں سے کچھ نے سادے کاغذ پر انگوٹھا لگا کر علاقہ کے نو آباد بڑے فارمرز سے مدد لی۔ قرض سے چھٹکارا تو مل گیا مگر ساتھ ہی خود اپنی زمینوں پر سے ان کا قبضہ بھی ہٹتا گیا اور وہ اپنی ہی زمینوں پر روزانہ کی اجرت پر مزدور بن کر رہ گئے۔ بدلتے حالات کی وجہ سے پیدا شدہ مصیبتیں صدیوں پرانے زمینوں کے مالک تھاروؤں کے لیے اب ہر وقت منھ کھولے کھڑی ہوتیں جس سے گھبرا کر کچھ تھارو خاندان نیپال کی ترائی کے جنگلوں میں جا بسے ایماندار اور ستھری طبیعت کے مالک تھارو عام دنیا کے چکرا دینے والے طور طریقوں کے سامنے ٹک نہیں پا رہے تھے اور خود ان کا قانون اب ان کی ملکیت بچا لینے اور ان کی حفاظت کرنے سے قاصر تھا جس سے عدم تحفّظ کا

احساس بڑھتا جا رہا تھا۔

کبھی کبھی سردار بنتا سنگھ بوٹا سنگھ کے ساتھ ٹہلتے ہوئے کھیم سنگھ کے کھیتوں کی طرف بھی نکل آتے دھانوں کی لہلہاتی فصل کے بیچ کام کرتے کھیم سنگھ اور اس کے والدین سے باتیں کرتے تو بڑی محبت اور اپنائیت سے دوستانہ انداز میں لیکن کھیم سنگھ اور اس کے والدین اندر ہی اندر سہمے جاتے ان کے چلے جانے کے بعد ہلکا سا خوف ان پر چھایا رہتا۔

فصل کٹنے سے پہلے ہی کھیم سنگھ کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں گھر کی باہری دیوار کے بیچ ڈیوڑھی نما دروازہ نکال کر سائبان کی طرح کشادہ کمرہ تیار کر لیا گیا۔ زیور کپڑوں اور شراب کا مکمل انتظام ہو جانے پر بڑی دھوم دھام سے کھیم سنگھ روپا کو بیاہ لایا۔ کئی دنوں تک رقص و سرود شراب اور طعام کی محفلیں جمتی رہیں پورے جوش و خروش سے ساری بستی رنگ رلیوں میں مگن تھی کہ خبر ملی کھلیان میں پڑے ہوئے دھانوں میں آگ لگ گئی ہے۔

منوں دھان جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ انھیں دھانوں کے عوض بنجارے تاجروں سے سونا چاندی کپڑے نمک وغیرہ شادی کے لیے بطور قرض لیے گئے تھے زندگی میں پہلی بار کھیم سنگھ نے ماں کی آنکھوں میں آنسو اور باپ کی پیشانی پر فکر کی لکیریں دیکھی تھیں۔ ہنستے گاتے گاؤں پر اداسی کا سناٹا چھا گیا بجھے دل سے

آہستہ آہستہ قبائیلی آپس میں باتیں کرتے ہوئے خود اپنی فصلوں اور غلّہ کی خیر منا رہے تھے حفاظت کا کوئی بھی طریقہ خود ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اسی وقت سردار بنتا سنگھ سردارنی اور بیٹے بوٹا سنگھ کے ساتھ پہلی بار بستی میں آیا۔ سر پر پگڑی دوپٹی دھوتی کے ساتھ انگرکھا پہنے یعنی مکمل روایتی پوشاک میں ملبوس مہمان آئے تھا رو دری بھی چارپائیوں پر بیٹھے تھے اُن سے کھیم سنگھ کا گھر پوچھتے سردار جی ادھر ہی آ گئے تھا رو بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں گاؤں کا پردھان بہاری سنگھ رانا اٹھ کر ان کے استقبال کو آیا اور کھیم سنگھ کے گھر والے اپنا غم بھول کر ان کی تواضع میں لگ گئے۔

گیارہ روپئے نوید کے دیتے ہوئے سردار بنتا سنگھ نے بتایا چونکہ وہ پہلے کہہ چکے تھے اس لیے بے بلائے خود ہی آ گئے ہیں۔ اس ڈرامائی دوستی کے پس منظر میں دور تک پھیلی کھیم سنگھ کے خاندان کی زرخیز زمین تھی۔

گھیر دار لہنگے پر چست چولی اور سر پر بندھے اٹھے ہوئے جوڑے کو ڈھکتی ہوئی پیچھے کمر کے نیچے تک پھیلی اوڑھنی کے ساتھ سر سے پیر تک زیورات سے سجی رو دیا میواڑ کے قلعہ کی معصوم شہزادی کے پُر وقار انداز میں جھونپڑے سے نکل کر کھیم سنگھ کی بہنوں کے ہمراہ سردارنی کے پاس آئی تو سردارنی نے مزید گیارہ روپے منھ دیکھائی کے نام سے دیئے۔

سامنے بیٹھا بوٹا سنگھ کھیم سنگھ سے باتیں کر رہا تھا لیکن اجنتا کی گفاؤں کے تراشیدہ مجسمہ کی طرح سانچے میں ڈھلا روپا کا حسین پیکر بوٹا سنگھ کی نگاہوں میں سما گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے دل نے دھڑکنا بند کر دیا ہے۔

اپنے حسنِ اخلاق سے متاثر کرنے کے بجائے یہ بے بلائے مہمان جاتے جاتے تھاروؤں میں مزید کسی خطرے کا خدشہ پیدا کر گئے۔

کھیتوں میں کام کرتے ہوئے یا جنگل میں لکڑیاں کیکڑے اور مچھلیاں پکڑتی تھارو عورتوں کے گہرے رنگین تاگوں سے پھول بوٹے کڑھے ہوئے لباس نظر آتے ہی بوٹا سنگھ اس طرف کسی نہ کسی بہانے ضرور جاتا مگر روپا کو ان میں نہ دیکھ کر مایوس ہو جاتا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ نوخیز لڑکیاں اور نوعمر بہوئیں بستی کے اندر گھر گرہستی کے کاموں میں مثلاً کھانا پکانے اور اپنے لباس سینے اور ان پر کشیدہ کاری بنانے میں مصروف رہتی ہیں۔ دیدارِ شوق کی آرزو لیے وہ کھیم سنگھ کو پوچھتا ہوا ایک دن تھارو بستی بھی گیا مگر معمر تھاروؤں نے اسے "کھیم سنگھ تمھارا یار کھیتوں کی طرف گیا ہے" کہہ کر بستی کے باہر ہی سے اسے لوٹا دیا تھا۔

کھیتوں سے گھر آتے ہوئے راستے میں ایک دن کھیم سنگھ کے باپ کو سانپ نے کاٹ لیا۔ قبائلی ڈاکٹر اور جھاڑ پھونک کرنے والے جو "بھرا" اور "سیانے" کہے جاتے ہیں بلائے گئے مگر سب بے سود۔ ان کی کوئی بھی کوشش

جان بچانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

باپ کی اچانک اور بے وقت موت سے کھیم سنگھ کے سامنے کئی دشواریاں آکھڑی ہوئیں۔ بنجارے مزید قرض دینے کو تیار نہ تھے ایسے آڑے وقت میں سردار بنتا سنگھ نے کفن سے لیکر شراب تک مہیا کردی کہتے ہیں جہاں تھارو دہاں دارو۔ خوشی ہو یا غم شراب کا استعمال دونوں حالتوں میں ہوتا ہے جنازے کے چاروں طرف بیٹھ کر شراب پینے کے بعد میّت اٹھائی گئی چوں کہ سانپ کے کاٹنے سے موت ہوئی تھی اس لئے تھارو عقیدے کے مطابق جلانے کے بجائے اسے مغرب کے رُخ پر دفن کر دیا گیا۔ بعد کے تمام کاموں کا صَرفہ بھی سردار بنتا سنگھ نے اٹھایا ساتھ ہی بنجارے کا قرض بھی ادا کر دیا گیا۔ ماں کے ساتھ کھیم سنگھ بھی گھبرا اٹھا لیکن بنتا سنگھ انھیں سمجھا جا رہا تھا۔

کھیم سنگھ تو بوٹا سنگھ کے ساتھ کھیل کر بڑا ہوا ہے تجھ میں اور اس میں میرے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے۔ اَوروں کی طرح میں نے تجھ سے نہ تو پرونوٹ لکھوائے ہیں اور نہ ہی دستاویز۔ سادے کاغذ پر انگوٹھا بھی نہیں لگایا پھر کیوں گھبراتا ہے؟"

کھیم سنگھ نے لاجواب ہو کر ماں کی طرف دیکھا تو سردار جی نے فوراً ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"بہن جی یقین مانو کوئی دھوکا نہیں ہو گا۔"

ماں بیٹوں کو کچھ ڈھارس ہوئی مگر پورا اطمینان نہیں ہوا تھا۔

تھوڑے دنوں بعد ایک دوپہر کا غذات کا اندراج کرنے والا پٹواری کھیم سنگھ کو اس کی زمینوں سے بے دخلی کا پروانہ تھما گیا تھا جسے لیکر وہ سردار بنتا سنگھ کے پاس گیا۔ وہ ملے نہیں۔ بوٹا سنگھ نے اسے پھر آنے کو کہا۔ صبح سے شام اور شام سے کل آنے کی بات ہوتی گئی مگر بنتا سنگھ سے کھیم سنگھ نہ مل سکا۔

اس علاقے میں دوسرا کوئی روزگار نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً کھیم سنگھ اور بھنور سنگھ آس پاس کے فارموں پر مزدوری کرنے لگے۔ ماں پے در پے کئی صدمے اٹھا کر بیمار رہنے لگی تھی۔ زمینوں کے نکل جانے کا غم اسے اندر ہی اندر کھلائے جا رہا تھا پھر بغیر دوا علاج کے صحت کی کوئی اُمید بھی نہ تھی۔

کھیم سنگھ پٹواری کا دیا ہوا کاغذ کا ٹکڑا لیے ہوئے بڑی اُمیدوں سے بنتا سنگھ کے گھر جاتا مگر وہ ملتے ہی نہیں تھے۔ دھیرے دھیرے اس کے اندر جھنجھلاہٹ آنے لگی اور اس نے طے کر لیا اب ان کے پاس نہیں جائے گا۔

بوٹا سنگھ کی حویلی کے سامنے سے نکلی پکّی سڑک سے اتر کر نشیب میں ہو کر اس فارم تک کچّا راستہ جاتا تھا جہاں کھیم سنگھ اور بھنور سنگھ کی طرح مصیبتوں کے مارے کچھ اور تھار واب مزدوری کرنے جاتے تھے ماں اب پہلے سے زیادہ کمزور

ہوگئی تھی۔ اس لئے گاؤں کی عورتوں کے ساتھ کھیم سنگھ کا کھانا لے کر روپا جانے لگی تھی۔ کھلی کھڑکی سے بوٹا سنگھ کی نظریں روپا کے پیکر کا طواف کرتی گئیں۔ اب تو روز ہی وہ روپا کو آتے اور جاتے دیکھتا سڑک کے آس پاس چکر بھی لگا آتا۔ مگر روپا کے ساتھ دوسری تھارو عورتیں بھی اس کا نوٹس لیے بغیر گزر جاتیں۔

ترائی کے علاقے میں موسم سرما کی بارش اور اولے گرنے سے موسم بیحد سرد ہو گیا تھا۔ ٹھنڈک کے ساتھ ہی ماں کی علالت بھی بڑھ گئی تھی اس لئے گاؤں لے جانے والی عورتوں سے روپا کھیم سنگھ کو کھانا بھیج دیتی اور خود ماں کے پاس بیٹھی ہوتی۔ خاندان خواہ کتنا ہی بڑھ جائے مگر تھارو کنبے بڑی محنت کے ساتھ مشترکہ طور پر رہنا پسند کرتے ہیں خاص طور سے بزرگ خاندان کی بہت عزت کرتے ہیں۔

آسمان ابر آلود تھا اور خنکی بڑھتی جا رہی تھی صبح سے ہی کھیتوں فارموں اور جنگل کو گئے تھاروؤں کا کھانا لیکر عورتیں بھی جا چکی تھیں ہمیشہ کی طرح اس دن بھی بستی کی دوپہر سنسان تھی جب ماں اکھڑی ہوئی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ ضعیف اُتم سنگھ خود تیز چل نہیں سکتا تھا اس لیے اس نے روپا کو فارم پر سے کھیم سنگھ کو جلدی سے بلا لانے کو بھیجا۔

بڑی بڑی بوندیں گر رہی تھیں۔ آج کئی دنوں بعد بوٹا سنگھ نے حویلی کے برآمدے سے تیز قدم اٹھاتی اکیلی روپا کو سڑک پر جاتے دیکھا۔ اسے عرصہ سے

ایسے موقعہ کی تلاش تھی اس کے اندر خواہش کی دبی چنگاری اچانک شعلہ بن گئی۔

گہرے رنگین تاگوں سے کڑھے بیل بوٹے دار لہراتے سیاہ لہنگے پر اُڑتی کالی چُنری کے پیچھے سے سخت فولادی ہاتھوں سے بوٹا سنگھ نے روپا کا منھ سختی سے دبا رکھا تھا۔ نشیب سے اوپر کی طرف چڑھتے ہوئے کھانا پہونچا کر واپس لوٹتی ہوئی عورتوں نے شور مچا دیا۔ تھارو اکٹھے ہو گئے لاٹھی کا بھرپور وار بوٹا سنگھ کے سر پر پڑا تو روپا اس کے فولادی شکنجے سے آزاد تھی کھیم سنگھ اور روپا جب گاؤں میں داخل ہوئے تو ماں دم توڑ چکی تھی۔

اس واقعہ کے چوتھے دن تھارو بستی میں پہلی بار پولیس آئی کھیم سنگھ کو گرفتار کر کے جنگلوں سے باہر کی دنیا میں لایا گیا۔ مقدمہ چلا عدالت نے فیصلہ سُنا دیا۔

سردار بنتا سنگھ کی حویلی کے اندر چوری کے ارادے سے کھیم سنگھ داخل ہوا تھا مگر جاگ اٹھنے پر لاٹھی کے وار سے بوٹا سنگھ کو زخمی کر کے فرار ہو گیا تھا اس جُرم کی سزا پورے سال بھر کی قید با مشقت تھی۔

آج پورے سال بھر بعد کھیم سنگھ اپنے جھونپڑے میں بیٹھا تھا اس کے لبوں پر سکوت تھا مگر خیالات کی کشمکش میں کھویا ہوا۔ کونے میں بیٹھی روپا آنسو بہا رہی تھی۔ جلتے دیئے کی لو بھڑک رہی تھی۔ کھیم سنگھ اپنی ساری قوت یکجا کر کے

اپنی جگہ سے اٹھا ردپا کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر وہ کہہ رہا تھا۔

"سنو ردپا۔ صدیوں پہلے پدمنی کے جوہر کے بعد ہمارے پوروج اپنی مان مریادا بچانے کو اپنا دیش چھوڑ کر ان جنگلوں میں آبسے تھے کل صبح کا سورج نکلنے سے پہلے ہی ہم اس تھار دبستی کو چھوڑ کر کہیں اور جا بسیں گے۔"

سر اٹھا کر سرخ آنکھوں سے ردپا نے کھیم سنگھ کی ہمیشہ سے مسکراتی آنکھوں میں دیکھا جہاں محبت کی گہرائی جاگ رہی تھی۔

ہوئے دیا کا نام

تیز دھوپ گرمی اور تکان کے بہانے میں اپنا آگے جانے کا پروگرام فی الحال منسوخ کر کے اپنے فلیٹ پر لوٹ آیا تھا جہاں بستر پر لیٹے لیٹے میں اپنے خیالات کے تانے بانے میں الجھا تھا۔ ایک ہفتہ پہلے ہی میں نے آکر پروجیکٹ آفیسر کی حیثیت سے یہاں کا چارج سنبھالا تھا یہ علاقہ میرے لیے نیا نہیں تھا تقریباً پندرہ برس قبل میں اس علاقے کے ایک ایک آدی واسی گاؤں میں مہینوں پیدل گھومتا پھرا تھا۔

اس وقت جب ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد بھی میں اپنی بیروزگاری سے گھبرایا چاروں طرف بھٹکتا رہا تھا ایسے دنوں میں اچانک ایک صبح اخبار میں "دس روپے یومیہ پر قبائلی علاقے میں گاؤں گاؤں گھوم کر سروے رپورٹ تیار کرنے والے اسامیوں کی ضرورت ہے" کا اشتہار پڑھ کر میں نے اپنی درخواست اس سرکاری آفس میں پہونچا دی تھی۔ جہاں سے چند دنوں کے اندر ہی مجھے

بلا کر یہ کام سونپ دیا گیا تھا۔

تب میں پہلی بار اس قبائیلی علاقے میں آیا تھا۔ کندھے سے لٹکتے جھولے میں کچھ لکھنے پڑھنے کا سامان سرکاری آفس سے ملے سروے کے فارم کا پلندہ اور ایک عدد کرتے پاجامہ کا جوڑا لئے اپنے پیروں میں چپل پہنے کرتے پاجامہ میں ملبوس میں یہاں آ تو گیا تھا مگر نہ کہیں رہنے کا ٹھکانا اور نہ ہی کہیں آس پاس کچھ کھانے کا انتظام۔ قبائیلی گاؤں کہیں ایک دوسرے کے پاس اور کہیں میلوں کی دوری پر آباد۔ ان کا راستہ جنگلوں سے گزرتا جو زیادہ تر میں پیدل طے کرتا۔

قبائیلی بستیوں میں پہونچ کر بھی اپنی پہچان خود بتانی پڑتی۔ درمیانی اجنبی پن دور کرنا خاصہ مشکل ثابت ہوتا پھر بھی میں خوش تھا کہ روزگار سے لگا ہوں۔ کام اس وقت اور دشوار ہوتا جب سارا گاؤں مشتبہ نظروں سے مجھے دیکھتا۔ دن دن بھر فرداً فرداً آکر مجھ سے سوالات پوچھتے۔

"کیا جنگل دبھاگ سے آئے ہو"؟

"کیا کارندے پٹواری ہو"؟

"نہیں تو پھر کون ہو؟"

"ٹھکانا ڈھونڈھتے ہو جنگل میں؟"

ایسے بہت سے سوال جن کے جواب میں انھیں یہ سمجھاتا آگے آپ کے فائدے کے لیے سرکار بہت کچھ کرنا چاہتی ہے آپ مانگیے بتایئے میں اس کاغذ کو بھروں گا اس پر لکھوں گا پھر وہ سرکار پورا کرے گی۔

"کچھ نہیں مانگنا۔ سب ہے ہمارے پاس"

پُر قناعت اور پھر علیحدگی پسند کنارہ کشی کی زندگی اپنی جنگلوں تک محدود دنیا میں صدیوں سے بتاتے چلے آئے قدیم باشندوں کا روکھا جواب ہوتا۔ میں انھیں آگے سمجھاتا کہ وہ سرکار سے کیا کیا مانگ کر سکتے ہیں اور ان سے سب کو کیا کیا فائدے اور آرام و راحت پہونچ سکتی ہے شام ہو جاتی وہ مجھے اپنے ساتھ کھانا کھلاتے میرے سونے کا انتظام کر دیتے۔ اگلی صبح پھر ویسے ہی سوال پوچھتے۔ دو دو دن گزر جاتے لیکن کوئی بھی اللہ کا بندہ فارم اپنے نام سے بھروانے کو تیار نہ ہوتا۔ تیسرے چوتھے دن کہیں جاکر وہ میرا اعتبار کرتے دو چار فارم میں بھرتا پھر ان میں سے کوئی ایک دوسرے قبائیلیوں کو چونکا دیتا کہ اس میں کہیں کھوٹ یا دھوکہ ضرور ہے۔ میں انھیں لاکھ سمجھاتا کوئی نہیں سنتا۔ میں انھیں سوچنے سمجھنے کا موقعہ دیکر آگے دوسری قبائیلی بستی کی طرف مجبوراً نکل جاتا۔

یوں گھومتے کہتے سمجھاتے اور بار بار جاتے ہوئے آخر ان کو اتنا اعتبار آ ہی گیا کہ کچھ فارم بھر گئے۔ اب اکثر گاؤں میں قبائیلی عمر رسیدہ خواتین بھی مردوں کے ساتھ مجھ سے پوچھ گچھ کرنے لگی تھیں اور آ کر پاس میں بیٹھ بھی جاتی تھیں یوں تھوڑا بہت میں ان لوگوں میں گھل مل گیا تھا۔

میں شہر لوٹ آیا۔ سروے کے جو فارم بھرے جا چکے تھے انھیں میں نے جمع کر دیئے اجرت کے پیسے ملے تو ایک پرانی سائیکل خرید کر لیتا آیا میں نے محسوس کیا اس سے میری اہمیت قبائیلی علاقے میں کچھ بڑھ گئی محکمہ جنگلات کے کرمچاری یا پھر پٹواری کا رندے سائیکل لیئے ان کی آبادیوں میں کبھی کبھار آ نکلتے تھے۔

میں نے پھر اپنا کام شروع کر دیا اس بار تقریباً ہر گاؤں میں قبائیلیوں سے میری پچھلی اجنبیت ایک انسانیت میں بدل گئی تھی میں ہر گاؤں میں رات بسر کر لیتا۔ دن میں بھی بستی کے اندر گھوم ٹہل لیتا۔ بہاری نامی ایک گاؤں کے پردھان نے تو اپنے گاؤں میں چھپر ڈال کر ایک کمرہ سا الگ میرے قیام کے لئے تیار کر دیا تھا۔ مجھے مستقل طور پر اس میں قیام کے لئے بڑے خلوص سے شدید اصرار کیا تھا۔ اب میں اکثر وہیں

ٹھہرتا لیکن جہاں کہیں بھی جاتا اب فارم بھرنے میں کوئی دقت نہ آتی۔

اب فرصت ملی تو قبائیلی زندگی کو قریب اور غور سے دیکھنے پر بہت کچھ اس میں الگ الگ اور صدیوں سے محفوظ چلا آتا مجھے دکھائی دیا۔ جنھیں میں نے لکھنا شروع کیا۔ لکھنے کے لئے بہاری پردھان کا دیا وہ کمرہ میرے لئے اچھی جگہ ثابت ہوا۔ میں اب لگاتار کئی دنوں تک یہیں قیام کرنے لگا۔ اپنے اس قیام میں دھیرے دھیرے بہاری کے کنبے سے بھی میری جان پہچان بڑھتی گئی۔

بہاری اور ان کی بیوی ایک الگ گھر میں رہتے اور ان کی ڈھیروں اولادیں تھیں۔ جن میں سے پندرہ سولہ سال کی سب سے چھوٹی لڑکی گھمنی کے علاوہ سبھی بیٹے بیٹیاں شادی شدہ تھے۔ آس پاس کے بہت سے جھونپڑوں میں ان کے بیٹے بہوؤں اور پوتے پوتیوں کا لمبا چوڑا کنبہ آباد تھا۔ دور و نزدیک کے دوسرے کئی ایک گاؤں میں ان کی بیٹیوں کی سسرال تھی۔ کبھی کبھار کوئی نہ کوئی ان کی بیٹی ڈھیر ساری اولادوں کو لئے آیا جایا کرتی۔

بہاری پردھان کی بیوی جنھیں سب بدھنی کہہ کر بلاتے کئی بار مجھے بتا چکی تھیں کہ ان کی چھوٹی بیٹی کے پیروں میں چکر ہے وہ ایک جگہ ذرا دیر

نہیں ٹک کر بیٹھتی ۔ بس گھوما کرتی ہے اسی لئے اس کا نام سب نے گھمنی کر دیا۔ یہ میں نے بھی محسوس کیا تھا دن بھر میں وہ نہ جانے کتنی بار میرے جھونپڑے میں آتی اور جاتی۔ من مانے سوال پوچھتی۔

"کیا لکھتے ہو؟"

"آج کتنے کاغذ لکھے؟"

"کب تک لکھو گے؟"

"اتنا کیوں لکھتے ہو؟"

"یہ سب لکھ کر کیا کرو گے؟"

ایسے ہی بے ربط بے تکے نا سمجھی کے بہت سے سوال ہوتے۔ جب تک مجھے لحاظ رہا میں کبھی جواب دیتا اور کبھی توجہ نہ دیکر یا تو چپ رہتا یا پھر اپنے لکھنے میں مشغول رہتا۔ وہ واپس چل دیتی۔ لیکن کچھ دنوں بعد ہی میں اس کے اندر قدم رکھتے ہی اسے واپس چلے جانے یا پھر چپ رہنے کی تاکید کرنے لگا تھا۔ میری بات کا نہ وہ برا مانتی اور نہ ہی میری کبھی بات مانتی۔ آتے ہی کوئی نہ کوئی سوال جھٹ جڑ دیتی اور واپس جانے کے بجائے وہیں زمین پر اپنا سیاہ گھانگھرا پھیلا کر پسر کر بیٹھ جاتی اور دوسرا بے سر پیر کا سوال پوچھ اٹھتی۔ میں جھنجھلا جاتا وہ ہنستی اور اٹھ کر دروازے

کے باہر کہیں غائب ہو جاتی۔ میں چین کا سانس لیکر سوچتا اچھا ہے جو اس کی طبیعت کو کہیں قرار نہیں۔ ورنہ نہ جانے کتنا تنگ کرتی۔

ان دنوں میں بڑی سنجیدگی سے قبائیلی زندگی پر مضامین لکھ رہا تھا جو اب اخباروں اور رسالوں میں شایع ہونے لگے تھے اس سے لکھنے کا حوصلہ اور شوق بڑھتا گیا میں ان آدی واسیوں کے بارے میں بہت کچھ جان لینے اور سمجھ لینے کے لئے ہمہ وقت بیچین رہتا۔ بہاری اور بہاری کے کہنے والوں میں سے جو بھی پاس آ بیٹھتا میں ان سے رسم و رواج قاعدے قانون تیوہار اور ان کے تمدن و تہذیب وغیرہ کے بارے میں پوچھا کرتا۔ یوں میں نے بہت سی معلومات حاصل کر لیں۔ میں نے ان کے رسم و رواج اور قاعدے قانون کو سمجھا اور جہاں تک جانا وہ سب ہماری موجودہ مہذب دنیا سے قطعاً الگ تھے۔ قبائیلی آزادیٔ نسواں کے حامی تھے شادی بیاہ توڑنے اور کر لینے کا پورا اختیار قبائیلی خواتین کو سماج اور قانون کی رو سے حاصل تھا اتنا ہی نہیں جسمانی تعلق شادی سے قبل ہوں یا اولاد کی صورت میں سامنے آجائیں یا امید سے ہو کہیں کسی صورت میں کوئی مضائقہ نہیں۔ شادی کسی دوسرے سے ہو جاتی بیوی کے ساتھ وہ اولاد کو بھی قبول کرتا سماج و قانون کی رو سے وہ اسی کی اولاد ہوتی اور وہ عزت دار سمجھے جاتے

شادی شدہ خواتین کو پرانے آشناؤں سے میکے میں ملنے جلنے کی پوری آزادی ہوتی۔ بہاری اور بہاری کے کہنے سے میں نے بہت سی ایسی باتیں جان لی تھیں اور انھیں دنوں میں نے کسی شام گاتے ناچتے قبائیلیوں سے وہ لوک گیت بھی سنا تھا جس کے دو بند آج بھی مجھے یاد ہیں۔

تیل جلو باتی جلو ہوئے دیا کا نام
میکے سے ایک للو لائے ہوئے پیا کا نام

ادھر کافی دنوں پہلے سے یہاں ہولی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں بہاری پردھان تھا اسے ہولی کے موقعہ پر اپنے پورے گاؤں کی دعوت ناچ گانے اور شراب کا انتظام کرنا تھا۔ قبائیلیوں کی ہولی کچھ زیادہ ہی رنگین ہوتی۔ ہولی کے آٹھ دنوں اور راتوں کو صحیح معنوں میں یہ قبائیلی پھاگ کھیلتے گزارتے ہیں۔ میں نے بہاری سے یہاں تک سن رکھا تھا کہ ان دنوں خاص طور پر لڑکیاں میکے آتی ہیں۔ آشنا کے ساتھ شب باشی میں کنواری اور بیاہی کی تفریق نہیں رہ جاتی۔ لوک گیت سوانگ ناچ رنگ کی محفلیں ہی ہولی کی رونق ہوتیں ہیں یہ سب قلم بند کرنا چاہتا تھا اسی لئے ہولی کے موقعہ پر یہیں رکا رہا۔

بہاری پردھان کے بیان کی حقیقت ہولی کے موقعہ پر عیاں تھی مجھے

بھی اس کا اندازہ اور تجربہ بخوبی انھیں دنوں ہوگیا جب پھیلتی بکھرتی ہولی کی رنگینیاں میرے جھونپڑے میں گھمنی کو لے آئیں ان آٹھ راتوں کے اندھیرے اجالے میں بدلتے رہے تھے۔ ہولی کا نشہ ٹوٹتے ہی مجھے دو خط ملے تھے ایک ہیڈ آفس سے اور دوسرا میری ماں کی طرف سے دونوں میں ہی مجھے فوراً واپس بلایا گیا تھا۔ گھمنی سے کچھ کہے اور ملے بغیر میں بصد عجلت واپس چلا آیا تھا۔

قبائلی زندگی سے متعلق میرے لکھے مختلف اخباروں میں شایع ہونے والے مضامین اور سروے فارم کی خانہ پری کے ساتھ بنائے گئے میرے نوٹس دیکھ کر ہیڈ آفس نے مجھے ایک مستقل نوکری دے دی تھی جس میں مجھے اس قبائلی علاقے کی ترقی و بہبود کے لئے کئی پروجکٹ بنانے تھے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں والی مثل کے مصداق میں بھی خوش تھا کہ نوکری مل گئی میں وہیں رک گیا۔

میری ماں نے میری شادی طے کر دی تھی اب میرے انکار کا سوال ہی نہیں تھا یوں میں اپنی اصل زندگی اور اس کی مصروفیت میں ادھر سب کچھ بھول بیٹھا تھا۔ لمبے عرصے کے پندرہ سال بیت گئے میرے دونوں بچے بڑے ہوکر اسکول کی چھٹی ساتویں جماعت کے سالانہ امتحان دینے میں لگے تھے

وقت کے ساتھ ترقی کر کے پھر اسی علاقے میں بحیثیت پروجکٹ آفیسر کے میں دوبارہ آگیا تھا میری بیوی، بچوں کے امتحان ختم ہونے کے بعد آنے والی تھیں۔

برسوں پہلے یہ پروجکٹ میں نے ہی اس علاقے کے لئے بنایا تھا جس نے آج یہاں کے قبائلیوں کی زندگی کا نقشہ ہی بدل ڈالا تھا۔ علاقہ کو اب پہچانا ہی نہیں جاتا تھا، سڑکیں، سواریاں، اسکول، کھیتی باڑی اور مویشی پالنے کے نت نئے ذرایع پینے کا صاف پانی، بجلی، آدی واسیوں کے پختہ مکان، اسپتال اور بہت سی دستکاریاں اور ان کی تربیت کا انتظام غرض کہ ترقی کی روشنی سے یہ پورا علاقہ منور تھا اور سب سے نمایاں بات تھی کہ پروجیکٹ آفس میں کام کرنے والوں میں بہت سے آدی واسی تھے۔

اس پورے ہفتے یا تو میں قبائلی گاؤں میں جاتا یا پھر نزدیک و دور سے بزرگ اور ادھیڑ عمر کے قبائلی مجھ سے ملنے آتے سبھی نے مجھے یاد رکھا تھا ہم آپس میں مل کر بہت خوش ہوتے اور دیر تک گزری باتیں کرتے لیکن میں نہیں مل پاتا تھا تو ہماری پردھان سے۔ اب تک نہ وہ آئے تھے اور نہ میں ہی گیا۔ میں نے کسی سے ان کے بارے میں کچھ پوچھا بھی نہیں تھا۔ کئی بار جب پوچھنا اور جاننا چاہا بھی تو گھمنی کا خیال آجاتا جو

مجھے اندر ہی اندر روک دیتا۔ میری بیوی اور بچوں کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا بس دو ہفتوں بعد انھیں یہاں آنا تھا یوں مجھے ایک طرف اپنی بیوی بچوں کا خوف تھا تو دوسری طرف عام لوگوں کا ڈر۔ گھمنی کا نام مجھے بڑی بدنامی بھی دے سکتا تھا۔ بات سرکاری نوکری تک لے بیتنے والی بن سکتی تھی۔ صبح میں نے بہاری پردھان کے گاؤں جاکر ان سے مل آنے کا ارادہ کیا تھا مگر پھر ہمت نہیں ہوئی دو ایک قبائیلی بستی میں گھوم چکنے کے بعد تھکان۔ گرمی اور دھوپ کی تمازت کی بات بار بار کہہ کر میں نے جب آگے جانے سے انکار کیا تھا تو سامنے کھڑے گاؤں کے دو چار بزرگ قبائیلی ہنس کر بولے تھے۔

"ہاں بابو صاحب پہلے تو دن دن بھر پیدل چلتے تھے اب افسر ہو گئے جیپ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے دھوپ گرمی سے تھکان چڑھ آئی" میں بھی ان کے ساتھ ہنس کر رہ گیا تھا۔ اور اب پڑے پڑے میں سوچ رہا تھا ایسے کتنے دن چلے گا جس گاؤں جاتا ہوں یا یہاں پروجیکٹ آفس میں آکر سبھی قبائیلی عورت و مرد مجھ سے ملتے ہیں کسی دن گھمنی سامنے آگئی تب کیا ہوگا؟ ویسے بھی بہاری پردھان مجھے بڑا بے مروّت سمجھتا ہوگا کتنے دنوں تک میں اس کا مہمان رہا تھا۔۔۔۔ گھمنی کی شادی ہو چکی ہوگی وہ اب اپنے گھر کسی دوسرے

گاؤں میں ہو گی یہ قبائیلی تو بیٹی دوسرے گاؤں میں بیاہتے ہیں تو پھر کیوں نہ آج شام میں بہاری پردھان سے اس کے گاؤں جاکر مل آؤں۔ ابھی تو میری بیوی کے یہاں آنے میں دو ہفتے باقی ہیں۔ لیکن میرے جانے پر گھمنی وہیں مل گئی اور سب میں بات پھوٹ گئی تو پھر — میں سوچ میں پڑ گیا نہ جاؤں کیا؟ —— لیکن بہاری خود کیوں نہیں آئے اور کوئی خبر بھی نہیں بھجوائی کہیں وہ گزری بات پر میرے لئے اپنے دل میں نفرت سمیٹے نہ بیٹھے ہوں جانے پر دبا غصہ ابل پڑے آخر کو میں باہری آدمی تھا جو قبائیلی آزاد زندگی میں دخل اندازی کا قصوروار ہو چکا تھا۔ اسی لئے سیدھے سوچ میں پڑا میں نہ جانے کب سو گیا تھا۔

آنکھ کھلی تو آفس کا چپراسی ایک فائیل لئے کھڑا نظر آیا میں نے دستخط کر کے فائیل لوٹا دی لیکن بابو رام کو پھر بھی کھڑا دیکھ کر میں نے وجہ پوچھی۔ وہ کہنے لگا۔

"صاحب بہاری پردھان کی بیٹی گھمنی آئی دیر سے بیٹھی ہے آپ سوئے تھے" میرے پیروں تلے سے گویا زمین ہٹ گئی حلق سوکھ گیا بابو رام آگے بولا "وہ صاحب ہمارے گاؤں میں بیاہی ہے کئی دن سے آپ کو پوچھتی رہی تھی لیکن صاحب ——" اس کی بات پوری ہونے

سے پہلے گھمنی میرے سامنے آکھڑی ہوئی تھی میں حیران آنکھیں پھاڑے اسے بیٹھا دیکھتا رہا۔ گھیردار سیاہ لہنگے چولی کے اوپر شرارت سے بھری آنکھوں والا گول بھرا بھرا چہرہ سر پر ویسا ہی اٹھا ہوا بندھا جوڑا جیسے سیاہ بوٹے دار لمبا سا دوپٹہ ڈھکتا ہوا پیچھے پیٹھ اور کمر پر پھیلا لٹک رہا تھا زیورات سے سجا وہی پندرہ برس پہلے والا چست پیکر۔ اچانک وہ بول پڑی۔

"کیسے ہو بابو صاحب؟"

ہوش اڑ چکے تھے میں جواب کیا دیتا۔ بابو رام فائل لیکر چلا گیا تھا۔ وہیں زمین پر اپنا گھانگھرا پھیلا کر پرانے مخصوص انداز میں گھمنی پسر کر بیٹھ گئی تھی وہ بہت خوش تھی مجھے لگا وقت برسوں پیچھے لوٹ گیا ہے ہم پھر بہاری پردھان کی اسی پھونس کی جھونپڑی میں بیٹھے ہیں۔ جہاں رک رک کر اور ٹھہر ٹھہر کر وہ مجھ سے میرا حال پوچھتی جواب نہ پاکر اپنا حال بتاتی۔

اس کی زبانی یہ جان کر مجھے دلی صدمہ ہوا تھا کہ بہاری پردھان کا برسوں پہلے انتقال ہو چکا تھا ان کے بعد ان کی بیوی بھی ختم ہو گئیں لیکن میری زبان گنگ تھی اظہار افسوس نہ کر سکا۔ وہ آگے بولتی گئی اپنی شادی شدہ زندگی سے وہ بہت خوش تھی اب اس کے تین بیٹے ہو چکے تھے۔ رک رک کر پھر اس نے پوچھا۔

"تم نے شادی کی؟ بچے ہیں؟ بولو نا بابو صاحب"

میری قوت گویائی صلب تھی میں نے گردن ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ "پر بابو صاحب تم اس ہولی کے بعد پھر آئے نہیں۔ اس کے چار مہینے بعد ہماری شادی ہو گئی پانچ مہینے بعد میتو کا جنم ہوا پھر ہولی آگئی۔ میں میتو کو لیکر میکے گئی تھی تمہیں دکھانے پر وہاں تم نہیں آئے۔ میں ہر سال ہولی پر میتو کو لیکر مائیکے گئی تم آؤ تو تمہیں دکھاؤں۔ برسوں بیت گئے میتو سیانی ہونے کو آئی۔ وہ بڑی بھی ہو گئی تم اسے نہ دیکھ پائے۔

تمہاری جیسی ہے ایسا ہی رنگ روپ ــ اور ایسا ہی کاغذ قلم سے لگاؤ اسکول میں پڑھتی ہے۔ آکے اب دیکھ لینا"

میرا خون خشک ہو گیا نہ جانے یہ گھمنی کیا چاہتی ہے اب اس تذکرے کو لیکر یہ مجھ سے کچھ رقم چاہتی ہے یا پھر اس لڑکی کو میرے سر منڈھنا اور نہیں تو یہ سر بازار میری عزت اچھالنے کے درپے ہے۔ تیز غصہ سے میں کانپ اٹھا اور اس سے پوچھا۔

"یہ میتو کون ہے کہاں ہے اس کا نام لیکر مجھ سے کیا لینے آئی ہو تم آخر چاہتی کیا ہو"

گھمنی نے گہری نگاہ سے مجھے دیکھا ایسا لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو تم کچھ نہیں سمجھے۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی وہ آہستہ سے بولی۔

"میتو میری اور تمھاری بیٹی ہے آکر اسے آنکھ بھر کے دیکھ لو۔ میتو نام اسے میں نے دیا۔ وہ اپنے پتا کے پاس ہمارے گھر میں ہے۔ کسی ہولی پر آئے ہوتے ملتے اور اسے دیکھ لیتے تو میں آج یہاں نہ آتی ــــ پر بابو صاحب تم سارے رواج میرے باپو سے پوچھ پوچھ کر سمجھا کرتے تھے نہ جان پائے ہو گے کہ اس کے بعد آگے بھی ہولی پر آنا ہو گا۔ اچھا ہاں میتو کو دیکھنے میرے گھر آنا تو مت کہنا وہ تمھاری بیٹی ہے نہ میتو سے اور نہ کسی اور سے یہ بس میرے تمھارے بیچ کی بات تھی"

کہتے کہتے گھمنی زمین سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی ہنستی مسکراتی وہ خوشی سے بھرپور اپنے راستہ پر واپس چل دی تھی میں اسے جلتے دیکھتا چپ رہ گیا میرا سارا غصہ کافور ہو چکا تھا میرے دل و دماغ پر رکھا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ میرے کانوں میں برسوں پہلے اسی آدی واسی علاقے میں سنے لوک گیت کے دو بول گونج اٹھے تھے ؎

تیل جلو باتی جلو ہوئے دیا کا نام
میکے سے ایک للو لائے ہوئے پیا کا نام